سہ ماہی ادبی محاذ کٹک
APR - JUN 2017
اپریل۔جون ۲۰۱۷ء
زرسالانہ۔۱۰۰روپے
بذریعہ رجسٹری ڈاک۔۱۸۰روپے
Vol-1 Issue-3
گوشۂ غلام سرور ہاشمی
مدیر سید نفیس دسنوی

بیادِ پروفیسر سید منظر حسن دسنوی مرحوم
اور سید شکیل دسنوی مرحوم
شعروادب کی صالح قدروں اور عصری رجحانات کا ترجمان
سہ ماہی **ادبی محاذ** کٹک

اشاعت کا تیرھواں سال	۵۱/واں شمارہ

سر پرست: انجینئر سید آصف دسنوی
مدیر اعلیٰ: سعید رحمانی
موبائل۔ 07735860991 (صرف SMS کے لیے)
08763623951 (برائے SMS)

مدیر	معاون مدیر
سید نفیس دسنوی	سیّد نور الٰہی ناطق
Mob:9437067585	Mob:9237427933

منیجنگ ایڈیٹر
سمیع الحق شاکر موبائل 9861148800
کمپیوٹر کمپوزنگ:۔ سید مصطفےٰ علی موبائل۔8984218600

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
سعید رحمانی، اخبار اڑیسہ پبلی کیشنز، دیوان بازار۔ پوسٹ۔ بخشی بازار، کٹک۔ 753001
09437067585 (ضروری جانکاری کے لیے)
E-mail: adbimahaz@gmail.com
E-mail: Sayeedrahmani@gmail..com
Website: www.adbimahaz.yolasite.com

قیمت فی شمارہ: ۲۵/روپے زرِ سالانہ: ۱۰۰/روپے
رجسٹری ڈاک سے زرِ سالانہ۔ ۱۸۰/روپے
خصوصی زرِ سالانہ: ۲۰۰/روپے بیرونِ ممالک: ۲۵/امریکی ڈالر
(چیک یا ڈرافٹ پر نام کی جگہ صرف Md.Sayeed لکھیں۔ پتہ نہ لکھیں۔ چیک کے ذریعہ زرِ سالانہ ۱۲۵/روپے ارسال کریں۔ بیرونِ ملک کے لئے ۳۰/امریکی ڈالر)
IndianOverseasBank-A/CNo.172201000001688
IFSC Code-IOBA0001722-Branch-HaripurRoad,Cuttack
عدالتی چارہ جوئی صرف کٹک کی عدلیہ میں قابلِ سماعت ہوگی
مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

پبلیشر و پرنٹر شیخ قریش نے چتا پریس قاضی بازار سے چھپوا کر دیوان بازار کٹک سے شایع کیا

یادوں کی دہلیز سے
سید شکیل دسنوی مرحوم

غزل

بیچ بھنور میں چھوڑ کے تنہا خود جا پہنچے ہو اس پار
ڈوب گئی اس دل کی کشتی، ٹوٹے آشا کے پتوار
ہاتھ میں گاگر، چال قیامت، اس پہ چھلکتا تیرا روپ
کسی کے دل کی دھڑکن بن گئی تیرے پایل کی جھنکار
بیچ دیا تھا چار آنکھوں کی بات میں پڑ کر دل انمول
جی ڈھونڈے ہے اک گوری کے گاؤں کا میلہ، وہ بازار
یاد اسی کی ساتھ نہ چھوڑے پگ پگ تھامے میرا ہاتھ
تیاگ دیا جس ہرجائی کے کارن آخر یہ سنسار
کال اکال سے جیون نیّا چلی ہے کس منزل کی اور
کیا جانیں ہم مورکھ پرانی کون ہے اس کا کھیون ہار

بشکریہ
عبدالمجید فیضی (سمبلپور، اڈیشا)

ہمارے خصوصی معاونین

اپنی پنشن کی رقم سے ''اخبارِ اڑیسہ'' کا لگایا ہوا پودا اب اللہ کے فضل و کرم سے برگ و بار لا کر سہ ماہی ''ادبی محاذ'' کی صورت میں ارتقائی سفر طے کرنے لگا ہے۔میری تنہا ذاتی کوششوں سے شروع کیا ہوا یہ سفر اب 'لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا' کے مصداق ایک ادارے کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں مقامی احباب کے دامے درمے سخنے تعاون کے ساتھ ہی کل ہند سطح پر دیگر محبان اردو نے اپنی طرف سے ایک ہزار سے لے کر پانچ ہزار تک کے عطیات دیے ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ان میں سے بعض نے وقفے وقفے سے رقم بھیجتے رہنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔تمام محبان اردو سے نہ صرف کل ہند بلکہ عالمی سطح پر بھی لائف ممبر شپ قبول کرنے کی گزارش ہے۔

خصوصی معاونین کے اسمائے گرامی

نام	مقام
الحاج محمد ایوب خاں	بھوبنیشور
الحاج سیّد عطامحی الدین	بھدرک
الحاج سیّد ڈاکٹر مشتاق علی	کٹک
الحاج مولوی سیّد نذیر الدین صدیقی (ایڈوکیٹ)	کٹک
جناب محمد شاہنواز	بھوبنیشور
جناب سہیل اختر	بھوبنیشور
جناب عبدالمجید فیضی	سمبل پور
جناب ایم اے احد	بھوبنیشور
جناب محمد اسلم غازی	ممبئ
جناب سیّد علی شبنم کارواری	تھانے
ڈاکٹر محمد قمر الدین خاں	کٹک
جناب ایس این شیخ	ممبئ
مولوی محمد مطیع اللہ نازش	کٹک
جناب شیخ منور احمد حبیبی	دھام نگر (اڑیسہ)
جناب محبّ الرحمٰن وفا	یوڈا،مہاراشٹر
جناب وکیل نجیب	ناگپور
جناب سیّد محمود رضی الدین	راجستھان
جناب اقبال سلیم۔	بنگلور

نام	مقام
جناب ایم حمید الدین ناز	بیدر
پالوجی ڈاکٹر جاوید حسین	ممبئ
مس انجم ممتاز سلطانہ	بیدر
جناب رفیق شاہین	علی گڑھ
جناب سمیع الحق شاکر۔	کٹک
ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن بزمی	رانچی
ڈاکٹر جمال الدین احمد	بھوبنیشور
ڈاکٹر کرشن بھاوک۔	پٹیالہ
سید فرید منظر حسن۔	کٹک
ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی	نیپال
ڈاکٹر قمر الزماں۔	دھنباد
جناب بی۔ایس۔جین جوہر	میرٹھ
مولانا پھول محمد نعمت رضوی	مظفر نگر (بہار)
جناب ارشد قمر	ڈالٹن گنج
ڈاکٹر ملکہ خورشید	لکھنؤ
حاجی اختر حسین	بیل پہاڑ۔جھارسوگڈا
جناب جمال قدوسی	سدھارتھ نگر (یوپی)
جناب شمس الحق شمس (ایڈوکیٹ)	دیوپور (کٹک)

نام	مقام
ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری	کٹک
ابوالکمال ظفر احمد (ایڈوکیٹ)	بالیسر
جناب ارشد جمیل	کٹک
جناب شیخ بشیر احمد	کشمیر
جناب نظام مجھولیاوی	مظفر پور (بہار)
جناب رمیش پرساد کنول	پٹنہ
جناب اسحاق عابد	چنئی
ڈاکٹر مختار شمیم	بھوپال
بانو مہر سلطانہ بنت حمید الدین	بیدر (کرناٹک)
جناب جاوید ندیم	ممبئ
جناب فیروز احمد سیفی	نیویارک (امریکہ)
پروفیسر سید محمد استخار الدین	بجنور (یوپی)

ادبی محاذ کے گوشے

اگلے شمارے میں کٹیہار (بہار) کے ایک جواں سال اور خوش فکر شاعر سبطین پروانہ کٹیہاری کے گوشے کا انتظار کریں۔موصوف شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔نعتیہ اور غزلیہ شاعری کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے۔خصوصاً غزلیں بڑی عمدہ ہوتی ہیں۔

آپ بھی چاہیں تو اس ادبی گوشے میں شرکت کر سکتے ہیں۔تفصیل کے لیے اس فون نمبر پر رابطہ کریں۔نمبر ہے:09437067585

ایک ضروری تصحیح

محترم ابوالخیر ظفر صدیقی صاحب کا حمدیہ کلام اپریل تا جون ۲۰۱۶ء کے شمارے میں صفحہ۔۶؍ پر شایع ہوا تھا جس کے مطلع اور ایک شعر میں پروف کی غلطیاں رہ گئی ہیں جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔صحیح اشعار حسبِ ذیل ہیں:

مجھے کب ہوش رہتا ہے میں کب باہوش ہوں ساقی
نہ دل قابو میں رہتا ہے نہ سر بر دوش ہوں ساقی

مجھے تو نے ہی ہر دم دے دیے غم ساری دنیا کے
میں نازک دست و پا سے ہوں دلِ پر جوش ہوں ساقی

اس شمارے میں

قاضی مشتاق احمد
B/6,RAY.VENUE SOCITEY
I.C.S.Colony,Pune-411007(M.S)

محاذِ اول

ہمارے نام نہاد سماجی ٹھیکیدار کیا کر رہے ہیں؟ ایک طائرانہ نظر

سنگھ (آر ایس ایس) کے ترجمان ارگنائزر کے مدیر پرفُل کینکر نے وجئے دشمی کے موقع پر آر ایس ایس سربراہ موہن بھاگوت کی تقریر کے حوالہ سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ آر ایس ایس سماج میں تبدیلی لانے کے عمل کی تیاری مکمل کر چکا ہے۔ آسان زبان میں اس کا مطلب ہے کہ زعفرانی ایجنڈے کے مطابق تعلیم، تاریخ وتہذیب اور سیاست و پالیسی سازی جیسے کلیدی شعبوں پر اثر انداز ہونے کی منصوبہ بند کوشش کامیاب ہوتی نظر آ رہی ہے۔ آر ایس ایس نے حکمرانی میں اپنے رول کو واضح کرتے ہوئے ''راست مداخلت کار'' کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اسی لئے حکومت کو اہم فیصلے لینے سے پہلے ''سنگھ ہیڈ کوارٹر'' پر جا کر ''ماتھا ٹیکنا'' ضروری ہو گیا ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی کی 500-1000 روپے کے نوٹوں کی منسوخی کا اعلان کرنے سے پہلے ناگپور جا کر موہن بھاگوت سے ''چائے پر چرچا'' بجٹ پیش کرنے سے پہلے وزیر خزانہ ارون جیٹلی کی ''سنگھ پرمکھ'' سے گفتگو، وزیر داخلہ کا ''اچانک ناگپور دورہ'' اس کی چند ادنیٰ مثالیں ہیں۔ ادبی وتہذیبی تقاریب سے سیمیناروں اور مباحث کے انعقاد کے ذریعہ سنگھ سے الحاق رکھنے والی تنظیمیں نہایت منظم طریقے سے زعفرانی ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں سرگرم عمل ہیں۔ اس عمل کو ''دانشورانہ نظام بازگشت'' (Intellectual ecosystim) کا نام دیا گیا ہے۔

آر ایس ایس کی توجہ کا ایک اہم شعبہ تعلیم ہے۔ سنگھ سے ملحقہ ادارہ ''بھارتیہ شکشا منڈل'' نے پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک نصاب کو ''بھارت کی علمی روایت'' سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کئی تبدیلیوں کی تجویزیں پیش کی ہیں جنھیں حکومت نے قبول کر لیا ہے۔ تحقیقات کو حسب منشا رُخ دینے کے لئے اس تنظیم نے حال ہی میں پی ایچ ڈی گائیڈس کے لئے 26 / یونیورسٹیوں میں ورک شاپ منعقد کئے اور 55 / وائس چانسلر کو ''تحقیق برائے نشاۃ ثانیہ'' کے موضوع پر ایک کانفرنس کے لئے ناگپور مدعو کیا۔ (اور ہم اردو والے ان سازشوں سے بے خبر ''اردو داستانوں میں ہندوستانی اساطیر''۔ ''اردو میں غزل کا مستقبل''، ''اردو ادب میں جاسوسی ناول کی ضرورت''، فلاں شاعر کی شاعری پر ایک نظر'' موضوعات پر ''سرکاری خرچ'' سے مذاکرے اور سیمینار منعقد کرنے میں مشغول رہے)

ایک دوسری زعفرانی تنظیم ''بھاشا سرکشا منچ'' کے تحت ہندی اور علاقائی زبانوں کے فروغ کے لئے عدالتوں، قانون سازوں اور پروفیشنل کالجوں کی کارگزاری میں دخل اندازی شروع کر دی ہے۔ (حکومت ہند کے ایک ادارہ ''ہندی ڈائرکٹریٹ کے زیر اہتمام (ہندی زبان کے فروغ کے لئے) غیر ہندی علاقہ کے ہندی ادباء وشعراء کو ان کی بہترین تخلیقات پر ہر سال ایک لاکھ روپے کا انعام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک حسین اتفاق ہے کہ یہ انعام تواتر سے اردو کے تین افسانہ نگاروں کو (ایم مبین، راقم الحروف اور ساجد رشید) کو ملا۔ غیر اردو طبقہ میں تو اس کی پذیرائی ہوئی لیکن اردو کے چند ناعاقبت اندیشوں نے اس انعام کو (جس کا فیصلہ ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کرتی ہے) طنز کا نشانہ بنایا کہ اردو والوں نے یہ انعامات قبول ہی کیوں کئے۔ (ایک صاحب جنھیں لفظ ''طنز'' کے ہجے معلوم نہیں وہ ''طنز'' کو ''تنز'' لکھتے ہیں مجھے ایک خط میں ''اردو ادیب'' کی بجائے ''ہندی لیکھک'' لکھ کر میرا مذاق اڑایا جب کہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ میری چالیس سے زائد کتابیں اردو میں آ چکی ہیں اور ہندی میں صرف تین۔ ان میں سے ایک پر قومی ایوارڈ اور دوسری کتاب پر ۳۵ / ہزار ''منشی پریم چند ایوارڈ'' ریاستی ہندی اکاڈمی نے تفویض کیا)۔ کیا ہندی رسم الخط میں افسانے لکھنا کوئی جرم ہے؟ جب کہ اردو کے درجنوں ادباء وشعراء پریم چند، راہی معصوم رضا، سردار جعفری، رویندر ناتھ اشک وغیرہ نے ہندی میں لکھے تھے۔ (راقم نے تو ہندوستانی پرچار سبھا سے ''قابل'' کی سند اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی حاصل کر لی تھی) جب بھی کسی اردو والے کو کوئی قابل ذکر ایوارڈ ملتا ہے تو پتہ نہیں کیوں اردو ادب کے نام نہاد ٹھیکیداروں کا دل جل کر کباب ہو جاتا ہے۔ جب سردار جعفری کو ''گیان پیٹھ'' ملا تو ان پر یہ تنقید ہوئی کہ انھوں نے اٹل بہاری واجپائی کے سامنے سر جھکا کر ایوارڈ لیا۔ عینی آپا کو ایوارڈ ملا تو بعض دل جلوں نے لکھا کہ وہ ''اینگلو انڈین اردو'' میں لکھتی ہیں۔ شہریار کو ایوارڈ ملا تو کسی نے کہا ''ان کی شاعری میں امراؤ جان کے مجرے کے علاوہ اور کیا ہے''۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں انعام دینے والوں تک بھی پہنچتی ہیں۔ (بلکہ ہمارے چند پیشہ ور قلم کار اس خدمت پر معمور کئے گئے ہیں) یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ایم مبین کے زمانے میں انعام کی رقم 50 / ہزار تھی جو اٹل بہاری واجپائی کے ایما پر ایک لاکھ کر دی گئی۔ (اب آپ اس میں بھی کیڑے نکالیں تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟) اور ایک بات جس کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ایم مبین کو یہ انعام وزیر اعظم کے دست مبارک سے دیا گیا اور اس کے بعد کے انعام یافتگان (راقم الحروف اور مرحوم ساجد رشید) کو انعام کی رقم ڈرافٹ کی صورت میں بھجوا دی گئی۔ (کوئی تقریب نہیں ہوئی)۔ پونے میں سید آصف نامی ایک شاعر اور ڈراما نگار نے مہاراشٹر میں ہندی، اردو، مراٹھی، گجراتی اور اور دیگر علاقائی زبانوں کے قلم کاروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے ''اُردو ساہیتہ پریشد'' نامی ایک تنظیم بنائی۔ اس کے تحت تین اجلاس (پونے، بمبئی، چھچوڑ اور بیر) میں عظیم الشان پیمانے پر

ہوئے۔علاقائی پریس نے اس کوشش کو خوب سراہا لیکن ایک اردو والے کے پیٹ میں مروڑ اٹھی اور اس نے زہر اُگلا کہ ''یمپری چھچوڑا اجلاس میں اردو زبان کے اشعار ہندی رسم الخط میں لکھے تھے۔'' (اجلاس ایک غیر اردو علاقہ میں ہو رہا تھا اور اس کے اہتمام میں غیر اردو داں منتظمین نے تین لاکھ سے زائد کی رقم خرچ کی تھی۔مہمانوں کے قیام وطعام کا بہترین انتظام کیا تھا) جب منتظمین اس قسم کی بے جا تنقید کو سنیں گے تو انھیں اردو والے نام نہاد ٹھیکیداروں کی ذہنیت کا پتہ کیسے نہیں چلے گا؟ (نتیجہ یہ کہ اس کے بعد کسی نے عظیم الشان پیمانہ پر اس قسم کا اجلاس منعقد کرنے کی ہمت نہیں دکھائی۔اب ایک اچھے مقصد کے لئے قائم کی گئی انجمن ٹھنڈے بستہ میں چلی گئی) اس کے تحت چھوٹی موٹی محفلیں ضرور ہوتی ہیں۔سید آصف نے غیر اردو داں شائقین ادب کو اردو زبان اور شاعری سکھانے کے لئے چھوٹے پیمانہ پر کام شروع کیا ہے۔(ہندی زبان میں ''عروض آصفیہ'' نام کا ایک کتابچہ بھی شائع کیا ہے) اردو والوں کو اس قسم کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں۔اردو کا ایک بڑا طبقہ نہ تو زبان وادب کے لئے کچھ کرتا ہے اور نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔جس طرح ''بھاشا سرکشا منچ'' ہندی زبان کی ترقی وبقا کے لئے کام کر رہا ہے اور عدالتی نظام میں ''ہندی'' کو متعارف کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ایسا اردو کے لئے کون کر رہا ہے؟ کتنے اردو والوں کو معلوم ہے کہ اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۰ء میں انڈین پینل کوڈ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔غالب نے اپنی زندگی کے بیس برس مقدمہ بازی (پنشن، قرض کی ادائیگی، قمار بازی) میں گنوادئے۔ان کا مشہور شعر ہے:

پھر کُھلا ہے درِ عدالتِ ناز۔گرم بازارِ فوجداری ہے

حال ہی میں دلّی کے عدالتی نظام سے اردو کی اصطلاحات خارج کرنے کی بات چلی تھی۔اردو والے حسبِ عادت ''تیری بھی چُپ میری بھی چُپ'' کے اصول پر قائم رہے۔محکمۂ پولیس نے البتہ اس تجویز کی کھل کر مخالفت کی کہ اردو اصطلاحات زبان زدِ عام ہیں انھیں خارج کر دینا صحیح نہیں ہے۔اردو والے اس معاملے میں چُپ کیوں رہے؟

کیا ''یومِ اردو'' کے موقع پر اس مسئلہ کو مناسب طریقے سے اُٹھایا نہیں جاسکتا تھا؟ بعض کالجوں میں ''یومِ اردو'' کا انعقاد ضرور ہوا لیکن اس کا مقصد محض ''خانہ پری'' سے زیادہ نہیں تھا۔ہاں! اردو کے نام پر پلاؤ کھانے کے لئے احباب کو ضرور بلایا گیا اور بعض ''پیشہ ور مقررین اور مقالہ خواں حضرات'' نے ''مرتی ہوئی زبان'' کے نام پر فاتحہ پڑھ کر گھڑیالی آنسو ضرور بہائے۔ہماری نمائشی اردو ہمدرد انجمنیں چندہ جمع کر کے بزمِ قوالی، فلمی گانوں کے پروگرام برپا کرنے میں مصروف رہیں۔بلکہ اردو معاشرہ میں سناٹا ہی رہا۔(جاری)

حرفِ گفتنی

یو پی میں حالیہ انتخابات کے جو غیر متوقع نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں ان پر ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے سوشل میڈیا میں یہ بیان نظر سے گزرا کہ برادرانِ وطن کے ہزاروں فرقے ہیں مگر وہ ایسے موقع پر ایک ہو گئے۔ان کے ہزاروں دیوی دیوتا بھی ہیں لیکن انھیں آپس میں اتحاد قائم کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔اس کے برعکس مسلمانوں کا ایک ہی خدا اور ایک ہی قرآن ہے اور سبھی ایک ہی کلمہ پڑھتے ہیں لیکن انھیں ایک ہونے کی توفیق ابھی تک نصیب نہ ہو سکی۔بہت پہلے علامہ اقبال نے اس ملی کرب کا احساس کر کے کہا تھا:

ایک ہے اپنا خدا اور ہے قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

علامہ کے زمانے سے ہی آپسی اتحاد کی باتیں کہی جارہی ہیں۔لیکن آج تک اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی ہے۔فروعی مسائل سے بالاتر ہو کر اگر اتحاد کی کوشش کی جائے تو کچھ امید نظر آتی ہے۔دوسری اہم بات یہ کہ اتحاد کی باتیں ہمیشہ عوام کی جانب سے بلند ہوتی رہی ہیں۔یہی وجہ ہے اتحاد پیدا نہ ہونے کی۔اس کا مثبت نتیجہ تبھی برآمد ہو سکتا ہے جب سبھی مسالک کے علمائے کرام ایک آواز ہو کر اتحاد کی کوشش کریں۔ناچیز کی سمجھ میں ایک یہی واحد راستہ ہے۔لیکن کیا علمائے کرام سے اس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے؟۔یہ سوچنے والی بات ہے۔آج ہم جس دورِ ابتلا سے گزر رہے ہیں اگر آپس میں اتحاد پیدا نہ کریں اور ایک دوسرے سے یوں ہی دست و گریباں رہیں تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا انجام ہونے والا ہے۔خدا کرے کہ ہمارے علماء اس جانب توجہ دیں اور اتحادِ بین المسلمین ایک حقیقت بن جائے۔

ادبی محاذ کا یہ شمارہ بھی قدرے تاخیر سے آپ تک پہنچا ہے۔وجہ وہی گوشے کے لئے مضامین کا انتظار۔بہر حال دیر سویر سہی مضامین مل گئے اور گوشے کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ہم ان تمام قلمکار حضرات کے ممنونِ احسان ہیں جن کی گراں قدر نگارشات سے یہ گوشہ مزین ہوا۔صاحبِ گوشہ غلام سرور ہاشمی ایک جواں فکر شاعر ہیں اور بڑی سرعت سے ارتقائی منزلیں طے کرتے جارہے ہیں۔گوشہ کے مطالعہ کے بعد قارئینِ کرام اگر موصوف کو اپنے گرانقدر تاثرات اور مفید مشوروں سے نوازیں تو انھیں بے حد خوشی ہوگی۔

غزلوں کی ترتیب میں اس بار بھی حفظِ مراتب کا خیال رکھنا ممکن نہیں ہو سکا جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

سید نفیس دسنوی

حمد و نعت

انیس احمد خاں انیسؔ
91LawyersChambers
SupremeCourtofIndia
NewDelhi-110001
Mob:9811160288

حمد لکھ کر ثواب مانگتا ہوں
اپنے خط کا جواب مانگتا ہوں
زندگی کا نصاب مانگتا ہوں
ایک اُم الکتاب مانگتا ہوں
لاڈلا ہوں ثواب مانگتا ہوں
نیکیوں کا حساب مانگتا ہوں
تیرے جلووں کی تاب مانگتا ہوں
اک نظر کامیاب مانگتا ہوں
جاگتے سوتے بس تجھے دیکھوں
یہ حقیقت یہ خواب مانگتا ہوں
مجھ کو جنت میں پھر پہنچنا ہے
اک طہورا شراب مانگتا ہوں
ہیں گنہ میرے بے شمار انیسؔ
رحمتِ بے حساب مانگتا ہوں

کرشن پرویز
At/P.O:Kharar
Dist:Mohali-140301(Punjab)

ہے نقش جن کے دل میں محبت رسولؐ کی
ان کے نصیب میں ہے زیارت رسول کی
دنیا کے مال و زر کی اسے کچھ ہوس نہیں
جس نے کمالی بخت سے دولت رسولؐ کی
جنت کا در کھلا ہے اسی کے لیے سدا
جو مانتا ہے دل سے نصیحت رسولؐ کی
جنت کا اصل میں وہی حقدار ہوگیا
جس نے قبول کر لی اطاعت رسولؐ کی
دنِ رات مانگتا ہوں خدا سے دعا یہی
پرویزؔ کو ملے گی وہ رحمت رسولؐ کی

عبرت مچھلی شہری
MohallaKhanzada..P.O:MachhliShaher
Dist:Jaunpur-222143(U.P)

نوٹ:اس طرحی نعتِ پاک میں تضمین کا مصرع ۳۹؍بار مسترد کرنے کے بعد کہا گیا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ تضمین حاصلہ مقابلہ قرار دی گئی۔

جلوۂ کونین حُسنِ مصطفےٰؐ کا فیض ہے
اور حُسنِ مصطفےٰؐ نورِ خدا کا فیض ہے
کہکشاں کہتے ہیں جس کو آج تک دنیا کے لوگ
وہ تو میرے مصطفےٰؐ کے نقشِ پا کا فیض ہے
اہل طائف کے کہاں بچنے کا اٹھتا تھا سوال
بچ گیا طائف تو صبرِ مصطفےٰؐ کا فیض ہے
جاہلیت بن گئی سج کر دُلہن تہذیب کی
کیا ترے کردارِ آئینہ نما کا فیض ہے
پتھروں کو موم کر دینے کا فن آساں نہیں
یہ تو بس اعجازِ خلقِ مصطفےٰؐ کا فیض ہے
فاتح مکہ نے دے دی دُشمنِ دیں کو اماں
کیا مرے جانِ اماں شانِ عطا کا فیض ہے
رحمتوں کا سلسلہ ٹوٹا کہاں ہے آج تک
''مصطفےٰؐ کا فیض تھا اور مصطفےٰؐ کا فیض ہے''
چاریارانِ نبیؐ کی ایسی سیرت پر سلام
جن کی سیرت، سیرتِ خیرالوریٰ کا فیض ہے
عبرتؔ آخر نعت کے کوزے میں کیسے بند ہو
ایک دریا آپؐ کی چشمِ عطا کا فیض ہے

جمیل فاطمی
At/P.O:Lakhmania
Dist:BeguSarai(Bihar)

عارضِ پُر نور تھا کیسا رسولؐ اللہ کا
چاند سے بھی تھا حسیں چہرہ رسولؐ اللہ کا
کاش ہوجاتی عنایت مجھ پہ بھی اللہ کی
دیکھ لیتا خواب میں جلوہ رسولؐ اللہ کا
گُنبدِ خضریٰ ہی رہتا ہے مرے پیشِ نظر
ہے تصور میں مرے روضہ رسولؐ اللہ کا
مجلسِ شوریٰ میں تھے جید صحابیؓ آپؐ کے
مرکزِ تنظیم تھا اعلیٰ رسولؐ اللہ کا
جانہیں سکتے وہاں تک حضرتِ روح الامینؑ
جس جگہ تک تھا قدم پہنچا رسولؐ اللہ کا
رحمتوں کی بارشیں ہوتی ہی رہتی ہیں وہاں
ہے جہاں جس دیش میں روضہ رسولؐ اللہ کا
ڈھونڈتی ہی رہ گئی دنیا جمیلؔ فاطمی
پر نہیں دیکھا کبھی سایہ رسول اللہؐ کا

مومن خاں شوقؔ
اشرف ولا۔مکان نمبر۔11-3-723
ملے پلی۔حیدرآباد۔500001
Mob-9985053093

اے رحمتِ عالم ایک نظر بر حالِ غریباں ہوجائے
یا درد گزر جائے حد سے، یا درد کا درماں ہوجائے
ہر سانس سے آیے بوئے وفا، ہر بات میں ہو جینے کی ادا
اک نشترِ یادِ شاہِ رُسل، پیوستِ رگِ جاں ہوجائے
جب اشکِ ندامت ٹپکیں گے، سرکار کرم فرمائیں گے
برسے گا مسلسل ابرِ کرم، جب نفس مسلماں ہوجائے
کیا قولِ نبی کی شرح کروں، کیا حسنِ عمل ہو مجھ سے بیاں
اجمال میں حق بن جایے اگر تفسیر میں قرآں ہوجائے
دیدارِ مدینہ ہوجائے، برسوں کی یہ خواہش ہے دل میں
سرکار کا ادنیٰ ہوں خادم، مجھ پر بھی یہ احساں ہوجائے
میں چاہوں کہ دنیا کی مشکل، ہوجائے جو آساں مشکل ہے
اے شوق دو عالم کی مشکل وہ چاہیں تو آساں ہوجائے

ڈاکٹر مسعود جعفری

حیدرآباد
موبائل ۔ 9949574641

رسولِ پاک کے نقشِ قدم ہمارے ہیں
انھیں سے گردشِ افلاک بھی سنوارے ہیں
میں روشنی کے لئے دربدر کہاں جاؤں
مرے رسول کی چادر میں جب ستارے ہیں
فرشتے آپ کے در پر جبین ملنے لگے
خدا کا آخری پیغام جب اتارے ہیں
کبھی تو ہوگا میسر حضور کا جلوہ
اسی امید پہ ہم نے بھی دن گزارے ہیں
انھیں کے ذکر سے ملتی ہے دولتِ کونین
کہاں کا سود وزیاں اور کہاں خسارے ہیں
مرے نبی کی رسالت کا فیض ہے مسعود
بجھے بجھے سے سبھی کفر کے شرارے ہیں

عبدالشکور پروانہ

اسلام پور۔مخدوم پور۔بوکارو۔827010
Mob-9431383718

مجھے اپنا جلوہ دکھا دیجیے نا
مری بگڑی آقا بنا دیجیے نا
کڑی دھوپ محشر کی اور تشنگی ہے
مجھے جامِ کوثر پلا دیجیے نا
گنہگار ہوں میں خطا کار ہوں میں
کرم کی نظر کا صلا دیجیے نا
یہاں نجدیت سر اٹھانے لگی ہے
ہمیں اس کے شر سے بچا دیجیے نا
کریں ظلم کا خاتمہ ہم جہاں سے
کہ بازوئے شیرِ خدا دیجیے نا
تڑپتا ہے پرواز فرقت میں ہردم
مجھے اپنی صورت دکھا دیجیے نا

الحاج حمید عکسی

مکان نمبر۔39-6-14 نظام پورہ
منڈی بازار۔ضلع ورنگل۔506002

سب سے بڑا ہے تیرا نام یا اللہ
تجھ سے ہی بنتے ہیں سب کام یا اللہ
دونوں جہاں کا تو ہے مالک اور مختار
رحمت تیری سب پر ہے عام یا اللہ
تیری عبادت میں رہتے ہیں جو مصروف
ان سب کو تو دیتا ہے انعام یا اللہ
منزل تک ہو میری رسائی اے مولا
روشن کردے میرا ہر اک گام یا اللہ
عکسی پر ہو چشمِ عنایت تھوڑی سی
یاد تجھے کرتا ہے صبح شام یا اللہ

یوسف رادمنش۔کابل(افغانستان)

ایک فارسی نظم

دریادِ مادرِ مہربان

اگر عشق مرا بود در دل و جان
بہ مادر بود و میدانید عزیزان
ہمہ ہستی و ایمانم از و بود
ولے افسوس برفت آں ماہِ تابان
ندانم مونس و ہمتائے مادر
کہ باشد چوب طبیبے بہر درمان
چہ دنیایست ایں دہرِ جفا جو
وفا و مہر اورا نیست امکان
دلِ یوسف چو گل پژمردہ گردید
کہ مرگش در بود آں یارِ جانان

طاہر حسین طاہر۔ناندیڑ(مہاراشٹر)

حضرت سید شکیل دسنوی مرحوم کی یاد میں

پیکر مہر و وفا سید شکیل
تھے محبت کی صدا سید شکیل
صاف گو انسانیت کے پاسدار
گویا مثلِ آئینہ سید شکیل
داغِ فرقت دے کے اہلِ علم کو
ہوگئے ہم سے جدا سید شکیل
ہر کسی کے دل میں ہے الفت بسی
کس قدر تھے دلربا سید شکیل
آپ کے بن ہوگیا سونا جہاں
گھر بھی ہے ماتم کدہ سید شکیل
جنتِ فردوس مل جائے تمہیں
ہے یہی سب کی دعا سید شکیل

گوشۂ احباب

(مراسلہ نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں)

☆**ڈاکٹر لطیف سجانی** (امراوتی) 2016 کے تینوں شمارے ایک ساتھ دیکھا۔ کیونکہ طبیعت مسلسل خراب چل رہی تھی جس کی وجہ سے ذہنی و جسمانی دونوں اعتبار سے کوئی کام کرنے کے لائق نہ رہا۔ تھوڑا افاقہ ہوا تو ادبی محاذ دیکھا۔ گوشہ ڈاکٹر حبیب راحت حباب' گوشہ سید شکیل دسنوی' گوشہ کبیر وارثی تمام گوشے معیاری ہیں' مضامین بھی جامع ہیں۔ اسے دیکھنے سے آپ کی علمی و ادبی بصیرت و بصارت کا علم ہو جاتا ہے۔ گوشے کی وجہ سے فن کار کی شخصیت' فن اور اس کی علمی و ادبی خدمات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کئی رسالوں کے کے گوشے منظر عام پر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض بالکل پست' ناکارہ اور غیر معیاری ہیں۔ مدیر کو ادبی خدمات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ پس گوشوں کی شکل میں انھیں پندرہ بیس ہزار روپے وصول ہو جاتے ہیں کافی ہے۔ صاحبِ گوشہ کو سو دو سو کاپیاں ارسال کر دی جاتی ہیں۔ رسالہ کے خریدار صرف ۲۵ رہوتے ہیں۔ فن کار اپنی شہرت ناموری اور عزت کی خاطر سب کچھ برداشت کر لیتا ہے۔ دراصل اکیسویں صدی میں اردو کا بُرا حال ہے۔ بیسویں صدی یا انیسویں صدی ہوتی تو اس طرح کے صحافیوں کا کوئی گزر نہ ہوتا۔ انھیں خودکشی کرنی پڑتی۔ دراصل اس طرح کے نامعقول 'مفاد پرست اور خود غرض صحافیوں کی وجہ سے اردو ادب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ بعض فن کار خود ہی اپنی ادبی خدمات پر مضمون لکھ کر کسی دوسرے کے نام پر شائع کروا لیتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو اردو ادب میں رائج ہے۔

☆**ضیا جعفر بنگلور** (کرناٹک) اکتوبر/دسمبر کا شمارہ پڑھا اور پڑھتا رہا۔ قاضی مشتاق احمد صاحب کا طنزیہ ''کیا یہی راج دھرم ہے'' کافی فکر انگیز رہا اور کئی واقعات کی صحیح تصویر کشی کی گئی ہے۔ گوشہ ''شکیل دسنوی'' میں قاضی رؤف انجم صاحب' ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی صاحب' منیر سیفی صاحب' شارق عدیل صاحب' ابرار نغمی صاحب' سید نفیس دسنوی صاحب' مدہوش بلگرامی صاحب' نصر اللہ نصر صاحب' احسن امام صدیقی صاحب' مجیب الرحمٰن وفا صاحب اور ارشد قمر جیسی قد آور شخصیتوں نے اُن کے فن کا خوب جائزہ لیا ہے۔

علیم صبا نویدی صاحب' منیر سیفی صاحب اور سعید رحمانی صاحب نے منظوم خراج عقیدت کا نذرانے پیش کئے ہیں اور ساتھ ہی سید شکیل دسنوی کی غیر مطبوعہ تخلیقات بھی شامل کی گئی ہے۔ جس سے ''گوشہ سید شکیل دسنوی'' یادگار بن گیا ہے۔

صبیحہ جہاں نے رؤف خوشتر کی ''کائنات طنز و مزاح'' کے اندازِ تحریر اور خوش رنگ تحریر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ''میرا تحریر کردہ افسانہ'' اور ''منظر بدل گیا'' کو قارئین نے کافی سراہا' میں فرداً فرداً سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پروفیسر مناظر عاشق صاحب کا افسانہ ''لہولہان وقت'' میں میری کہانی نظر آئی۔ ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ بھی گزر چکا ہے۔ افسانہ پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ حسن ساہو صاحب کی ''مختصر مختصر کہانیاں''۔ ایس۔ کیو۔ عالم' طاعت صاحب اور انجینئر سید فرید دسنوی صاحب کی کہانیاں بھی طنز سے بھرپور ہیں۔

غزل کا حصہ حسبِ معمول اس بار بھی بھاری ہے۔ غزلیں اچھی رہیں اور دوسرے مضامین بھی دلچسپ رہے۔ قارئین کے خطوط کافی پسند آئے۔

قدیر احمد قدیر (ہلکوٹی' کرناٹک) پچھلے شمارے میں میری غزل اور طرحی غزل کی اشاعت کے لئے صمیم قلب سے ممنون ہوں۔ گوشہ مرحوم شکیل دسنوی نہایت شاندار ہے۔ انشاء اللہ الگ سے تاثرات روانہ کروں گا۔ آپ کو اس قدر خوبصورت گوشہ کی اشاعت پر پُرخلوص مبارک باد۔

☆**اوج اکبر پوری**۔ رہتاس (بہار) عرصہ کے بعد اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ گوشہ حضرت شکیل دسنوی نہایت دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ جس پر محترم شکیل صاحب کی بولتی تصویر دیکھ کر انھیں دیکھنے کو طبیعت مچل گئی۔ لیکن اب وہ ملنے والے نہیں۔ لیکن اپنی تخلیقات میں زندہ ہیں۔ ادبی محاذ کو بامِ عروج بخشنے والی شخصیت آسودۂ خاک ہے۔ میں بھی انھیں دل کی گہرائی کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اس ماہ کے مشمولات میں نثری و شعری تخلیقات نہایت معیاری اور لائق مطالعہ ہیں۔

☆**ڈاکٹر منظر عاشق ہرگانوی**: تازہ شمارہ مل گیا' شکریہ۔ نفیس صاحب رسالے کو اپنی نفاست اور سنجیدہ شخصیت کی طرح بہتر اور معیاری بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ قلمکاروں کا بھرپور تعاون آپ کو مل رہا ہے۔ اڑیسہ کی ادبی تاریخ میں جو روشن باب آپ قائم کر چکے ہیں اس کی مثال نہ قبل ملتی ہے اور نہ آئندہ ملے گی کیونکہ آنے والا وقت ایسا سازگار نہیں ہوگا۔ بڑی سوجھ بوجھ سے آپ دونوں اسے گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔

☆**مرغوب اثر فاطمی** (گیا): سہ ماہی ''ادبی محاذ'' کا اکتوبر۔ دسمبر 16 کا شمارہ نظر نواز ہوا جو سید شکیل دسنوی کی حیات و ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے گوشہ کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ سرِ ورق پر ممدوح کی شاندار تصویر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اسم با مسمّٰی۔ مضامین عمدہ ہیں جن کی قرأت سے شکیل دسنوی کی مکمل شخصیت و ان کی ادبی جولانیٔ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں اپنے کمالات دکھلائے ہیں جو ان کی ہمہ جہت تخلیقیت کے غماز ہیں۔ منظوم خراج عقیدت کے حوالے سے محترم علیم صبا نویدی 'سعید رحمانی و منیر سیفی نے اپنے اپنے ہنر کا مظاہرہ کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ کل ملا کر شمارہ عمدہ ہے جس سے آپ کی مدیرانہ صلاحیتیں عیاں ہوتی ہیں۔

☆**عبدالمتین جامی** (اردو بازار۔ پدماپور ضلع کٹک): ادبی محاذ جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء کا شمارہ ہم دست ہوا۔ سید شکیل دسنوی مرحوم کے گوشے کے بعد ڈاکٹر فریاد آزر کا گوشہ تمام تر رعنائیوں کے ساتھ فی الوقت میرے سامنے ہے۔ قاضی مشتاق احمد صاحب نے اردو میلوں کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے قابل غور ہے۔ پہلے ہی اڑیسہ میں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے لیکن ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں اردو والوں کی تعداد بہت ہے جان کر خوشی ہوئی کہ وہ اردو کتاب خرید کر پڑھنے میں قابل لحاظ حد تک بہت آگے ہیں۔ طالب علموں میں اچھی کتابیں خرید کر مطالعہ کا شوق بڑھا ہوا ہے۔ سید نفیس دسنوی (مدیر ادبی محاذ) کا اداریہ بھی ڈاکٹر فریاد آزر صاحب کے تعارف کے سلسلے میں اہمیت کا حامل ہے۔ گوشۂ احباب کے باب میں قارئین کے خطوط بھی دلچسپ ہوتے جا رہے ہیں۔ مختلف موضوع پر ان کی بحث کارگر ہوتی جارہی ہے۔

فریاد آزر کے سوانحی منظر کے مطالعہ سے موصوف کی ادبی شخصیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ علاوہ ازیں جناب حقانی القاسمی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر کوثر مظہری، عمران عظیم، پروفیسر مولا بخش، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر ممتاز الحق اور سعید رحمانی کے مضامین میں کافی عرق ریزی کی گئی ہے۔ فریاد آزر جیسے نابغۂ روزگار شاعر کے گوشے کی ترتیب دینے میں ادارے کو بہت زیادہ دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس میں کوئی دو رائے نہیں۔ تاہم فریاد آزر فہمی کے لئے یہ گوشہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اتنا خوبصورت گوشہ نکالنے کے لئے ادارہ قابل مبارکباد ہے۔

علیم صبا نویدی کا مضمون 'مرحوم ظہیر غازی پوری کی رباعی پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر چاند نظامی کا مضمون ''ظہیر غازی پوری جنھیں زمانہ برسوں یاد کرے گا'' قابل مطالعہ ہے۔ ناوک حمزہ پوری کی رباعیاں ''نیا سال ۱۴۳۸ھ کی آمد'' پر ملت اسلامیہ کے کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی حد تک کارآمد ثابت ہوگی۔ لیکن ویران جنگلوں میں موتی بکھیرنے سے حاصل کیا ہوگا۔ باقی مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔
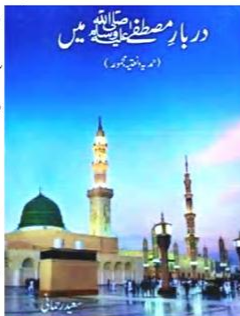
لیکن غزلوں کو شائع کرنے میں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے ایسا میں نے محسوس کیا ہے۔ بیشتر سینئر شعراء پیچھے رہ گئے ہیں جن کو سامنے رہنا تھا۔ بہر کیف منیر سیفی کے قطعات تاریخ بنام فرحت قادری، بیکل اتساہی اور سعید رضا گوہر عظیم آبادی بے حد پسند آئے۔ موصوف قطعات تاریخ لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں جان کر خوشی ہوئی۔ مبارک باد۔ موصوف کا ایک خط اسی شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں عبدالمتین جامی کے ''مونس سخن'' پر ناز پرتاپ گڑھی کے تاثرات کی بجائے مہدی پرتاپ گڑھی کے تاثرات چھپ گیا ہے۔ قاری اسے درست کر لیں۔ افسانہ کا حصہ بھی ٹھیک ہے۔ مختلف زبانوں کے افسانوں کا اردو میں تراجم بھی شائع کرنا چاہئے۔ بطور خاص اڑیسہ کی نمائندگی ہونی چاہئے۔ کتابوں پر تبصرے نپے تلے ہیں۔ بہر حال موجودہ شمارہ صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے بے حد حسین اور دل پذیر ہے۔ خدا آپ کی عمر میں برکت دے اور آپ اسی طرح اردو کی خدمت کرتے رہیں۔ آمین

جمیل فاطمی (بیگوسرائے، بہار): عرض یہ ہے کہ سہ ماہی ادبی محاذ کا تازہ شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء) تاخیر سے مل گیا تھا۔ لیکن فوراً مجھے دو مہینہ کے لئے گاؤں سے باہر جانا پڑ گیا اسی لیے خط لکھنے میں تاخیر ہوگئی۔ اس بار کے شمارے میں آپ نے جناب شکیل دسنوی مرحوم کا گوشہ شائع کیا ہے جو بہت عمدہ ہے پسند آیا۔ لیکن اُن پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہمہ جہت شاعر و ادیب دنیا میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت جگہ دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے۔ آمین

☆**منیر سیفی** (پٹنہ): ادبی محاذ جنوری۔ مارچ ۲۰۱۷ء میں فریاد آزر کا گوشہ پڑھا۔ مضامین اچھے ہیں۔ موصوف کا ایک شعر میرے ذہن میں محفوظ ہے:

ہواؤں میں شر پھیلا رہا ہے۔ پرندہ کتنا پر پھیلا رہا ہے

مشمولات کے اعتبار سے زیرِ نظر شمارہ معیاری کہا جائے گا۔ سید نفیس دسنوی صاحب ۲۴ / یا ۲۶ / جنوری کو پٹنہ آنے والے تھے؟ ☆☆☆

گزشتہ شمارے میں ڈاکٹر فریاد آزر صاحب کا گوشہ شایع ہوا تھا جس میں ان کا فون نمبر نہیں دیا جا سکا تھا۔ اس لیے بہت سے حضرات انھیں اپنے تاثرات سے مطلع نہیں کر پائے۔ یہاں ان کا فون نمبر دیا جا رہا ہے تا کہ ان سے رابطہ کر سکیں۔ نوٹ فرمائیں ان کا موبائل نمبر ہے۔

09990888234

منظومات

ڈاکٹر مسعود جعفری
Shaikpet Hyderabad
Mob:9949574641

قطعات کی شفق

اس کی تعریف میں پھر ایک رباعی کہہ دو
میں نے لکھ دی ہے ترے نام خدائی کہہ دو
سخت الفاظ برتنے سے گرے گی بجلی
نرم لہجہ میں اسے اس کی برائی کہہ دو

کہاں سے روک سکے گی ہمیں فصیل ابھی
نکل ہی جائے گی ملنے کی اک سبیل ابھی
ہمارے ہونٹ پہ چرچا ہے ترے قامت کا
محاورہ ہے ترا پیکر جمیل ابھی

گوالن دودھ لے کر جا رہی ہے
کمریا پیچ و خم بھی کھا رہی ہے
ہمارا دل پگھلتا جا رہا ہے
ہماری جاں لبوں پر آ رہی ہے

سمرقند اور بخارا بھول جاؤں
تمہارے حسن کے گھیرے میں آؤں
گزاروں عمر کے ایام اس میں
ہوا میں بادلوں کے ساتھ گاؤں

کھلی ہیں نکہتیں لہجے میں تیرے
سخن بھی ہوگئے مقبول میرے
کہاں دیوار کوئی درمیاں میں
مراسم ہوگئے ہیں اور گہرے

ہوئی ہے شام تو سجنے لگے ہیں
لتا کے گیت بھی بجنے لگے ہیں
پھنسے ہیں واہموں کے جال میں ہم
غبارِ کارواں لگنے لگے ہیں

ڈاکٹر علی عباس اُمید
Dr.Coloni-Eidgah Hilz
Bhopal-462001(M.P)

فسادات کے بعد کی نظم

سوال کرتا ہے بچہ یہ آگ کیسی ہے
زمیں سُلگتی ہوئی، آسمان خوں آلود
ابھرتی ڈوبتی سانسوں میں کھور اہوں میں

☆

یہ میرا شہر کہ گہوارۂ بہار رہا
کوئی بھی رُت رہی ماحول پر نکھار رہا
ہمیشہ اپنے پرایوں سے اس کو پیار رہا
یہاں اُگا نہ سکا فصل آنسوؤں کی کوئی
ابھی ابھی تو مرا دوست میرے ہاتھوں میں
خود اپنا ہاتھ دیے کہہ رہا تھا ہم دونوں
چلے چلیں گے یونہی اس جگہ جہاں رُک کر
زمیں کو چومتا ہے آسمان جھک جھک کر

☆

یہ کیا ہوا کہ اچانک وہ ہاتھ چھوٹ گیا
نہ جانے کون تھا جو میرے خواب لوٹ گیا
کہیں پہ چیخ کہیں سسکیاں کہیں آہیں
اُداسی گھلتی ہوئی روح میں ہر اک لمحہ
نہ کوئی دوست نہ ہمدم نہ غمگسار کوئی
بس ایک خوف ہے جس نے سبھی کو گھیرا ہے

☆

سوال کرتا ہے بچہ یہ آگ ہے کیسی
میں کیا جواب دوں اس آگ میں تو میرا بھی
جُھلس چکا ہے اک اک لفظ اور خاموشی
یہ کہہ رہی ہے کہ بے چہرگی کا ڈیرا ہے
تمام شہر میں بس موت کا بسیرا ہے

علیم صبا نویدی
No,192/266,Triplicane High Road
FlatNo,16,SecondFloor,RiceMndi
Street,Chennai-600005

تین سطری نظمیں

قاتل برسرِ اقتدار
مجرم آسودہ حال
غُربت سُولی پر

☆

پنگھٹ پہ شور
چوپال اُداس
نادیدہ واقعات

☆

وقت کمزور
لمحات مضمحل
صُورِ اسرافیل

☆

مقامی لوگ زندہ ہیں
یہ گنجائش نہیں
بُنیادیں کھوکھلی ہیں

☆

چاہتیں گمراہ کن
اذیت ناک لمحے
نیندیں حرام

☆

لذّت لمحوں کی
عیبوں سے راتیں بھرپُور
دن ہیں پاکیزہ

☆

ہنگامہ خیز خبریں
خون میں ڈوبی سُرخیاں
مہذب تصویریں

صابر فخر الدین
OPP:PoliceQuarters.MainRoad
P.O:Yadgir-585201(Karnataka)

نظمیں

اگر
بے آسماں ہوگی
زمیں تو / فرق کیا
ہوگا بتاؤ
☆
جو تصویریں
بنانا چاہتے ہیں
اُن کی تصویریں بھی
اک دن / بننے والی ہیں
☆
عمارت میں
جو مضبوطی ملی
نظر آتی ہے وہ
بنیاد ہی سے ہے
☆
وقت کی دہلیز پر
آ کر رُکا ہے
قافلہ
صدیوں سے
لمحوں کا
☆
جو سینے میں / بھڑکتی آگ کو
ٹھنڈا نہیں کرتے
وہ آنسو
بانجھ ہوتے ہیں
☆
زمینیں آسمانوں سے
ستیزہ کار ہوں گی تو
سکوتِ بے پناہی
ختم ہوگا

محمد باعشن مغموم کلکتوی
2nd Floor,4,Princep Street,
Kolkata-700072

موت

قصر عالی شان کو بھی گرادیتی ہے موت
گھونٹ دیتی ہے ہزاروں آرزوؤں کا گلا
کھینچ دیتی ہے یہ اکثر دار پر منصور کو
مانگ سے سیندور بڑھ کر نوچ لیتی ہے اجل
دلہنوں کے واسطے لے کر کفن آتی ہے موت
چوڑیوں کو توڑ دینا موت کا اک کھیل ہے
زیست کو مسرور پا کر اور جل جاتی ہے موت
سر سے یہ مریم کی چادر چھین لیتی ہے کبھی
بربطِ ہستی کے تاروں کی خموشی موت ہے
گلشنِ ہستی میں کیا ہے؟ بادِ صرصر موت ہے
میرے دروازے پہ جب مغموم آئے گی اجل

زلزلہ لا کر تباہی جب مچا دیتی ہے موت
لُوٹ لیتی ہے یہ اکثر زندگی کا قافلہ
خاک پر بے بس لِٹا دیتی ہے ہر مغرور کو
ظلم ڈھانے کی کبھی جب سوچ لیتی ہے اجل
شاخ کے سائے کی مانند پھیلتی جاتی ہے موت
رُخ ہوا کا موڑ دینا موت کا اک کھیل ہے
کشتیوں کو موج کی صورت نگل جاتی ہے موت
باپ سے اور ماں سے دختر چھین لیتی ہے کبھی
دل نشیں رنگیں نظاروں کی خموشی موت ہے
جو بھی ہے ذی جاں یہاں اُس کی مقدر موت ہے
اک تبسم بن کے لب پر پھیل جائے گی اجل

ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیا (پٹنہ)
Mob:9430528286

وقت

وقت کرتا ہے کب کسی کا انتظار
ایک پل کو بھی کہیں رکتا نہیں
چلتا رہتا ہے وہ اپنی چال سے
چھوڑ جاتا ہے پیچھے
کاروانِ زندگی
کتنی یادوں کی براتیں
کتنے فانوسِ خیال
اک ہجومِ بیکراں
جن کے قدموں کے نشاں
چار سو بکھرے ہوئے
ہم کو آتے ہیں نظر
ثبت ہیں جو کہ جبینِ وقت پر
دعوتِ نظّارہ دیتے ہیں ہمیں

حولدار سلیم الدین عامرؔ
OPP:PoliceQuarters.MainRoad
P.O:Yadgir-585201(Karnataka)

نفس کے نام

مرے نفس نے مری موت کو مرے دل سے آخر بھلا دیا
مری عظمتوں کے محل کو بھی مری سرکشی نے ہی ڈھا دیا
کبھی سوچ میں رہا گم تو میں کبھی وسوسوں کو بھی راہ دی
کبھی خواہشوں کے ہجوم نے مجھے راہِ شکر سے ہٹا دیا
تجھے بھا رہی ہے جو یہ زندگی کہ جس کو ہرگز بقا نہیں
جسے یاد رکھنا ضروری تھا اسی موت کو ہی بھلا دیا
مری زندگانی کے روز و شب تھے مثالِ شیشہ صفت مگر
مری لغزشوں نے اسے بھی تو بڑا بدنما ہی بنا دیا
میں بدی کی راہوں میں چل پڑا تو اس کا انجام یہ ہوا
مرے اس عمل نے ہی دوستو مجھے ہر نظر سے گرا دیا
مجھے ہر خطا پہ ملال ہے مرے دل میں خوفِ خدا بھی ہے
میں نے توبہ کی اور اپنا سر درِ کبریا پر جھکا دیا

گوشۂ غلام سرور ہاشمی

سوانحی اشارے

اصل نام: غلام سرور
تخلص: سرور
قلمی نام: غلام سرور ہاشمی
تاریخِ ولادت: ۸؍جون ۱۹۸۳ء
مقامِ پیدائش: سبڈ یلاٹولہ مرغیاں۔ گوپال گنج (بہار)
ولدیت: جناب صابر حسین
تعلیم: ایم۔اے (انگریزی اور اردو)، بی۔ایڈ (سنگیت میں ڈپلوما)
ملازمت: درس وتدریس، ہائی اسکول گوپال گنج (بہار)
آغازِ شاعری: ۱۹۹۹ء
اشاعت: پہلی غزل کی اشاعت روزنامہ سنگم بابت ۳؍دسمبر ۲۰۰۰ء
گھر جنت: ثنا ہاشمی۔ شریکِ حیات۔ شاعرہ بھی ہیں
صائمہ سرور۔ صاحبزادی
مشغلہ: شعروشاعری: مشاعروں میں شرکت، غزل گائیکی، نظامت وغیرہ
ادبی ولسانی خدمات، میٹرک کے طلبہ کو امتحان کے لیے تیار کرنا، بچوں کو انگریزی اور اردو کی مفت تعلیم دینا۔
اداروں سے وابستگی: رکن انجم ترقی اردو، گوپال گنج، میڈیا انچارج، سکریٹری انجمن فروغِ ملت، گوپال گنج
تصنیف: افکارِ سرور (شعری مجموعہ) زیرِ طبع
اعزازات: انجمن ترقی اردو سے انعام غزل گائیکی کے لیے۔
ساہتیہ کلا پریشد کی جانب سے ایوارڈ: ہندی وکاش سیوا سنستھا کی جانب سے گوپال گنج رتن سمّان وغیرہ
رابطہ: غلام سرور ہاشمی۔ بسڈ یلاٹولہ مرغیاں۔ گوپال گنج۔841428 (بہار)
موبائل: 09771119044
08507314584

مختصر تعارف

غلام سرور ہاشمی نئی نسل کے ایک تازہ کار شاعر ہیں۔ ان کا تعلق گوپال گنج بہار سے ہے۔ ہاشمی خانوادے کے چشم وچراغ ہیں۔ ۸؍جون ۱۹۸۳ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد جناب صابر حسین ہاشمی صاحب کی نگہداشت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سرِ دست گورنمنٹ ہائی اسکول میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ طالب علمی کے دور سے ہی انھیں شعروادب سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کا یہ ذوق بھی پروان چڑھتا گیا اور ۱۹۹۹ء سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کردیا۔ بڑی تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے آج اپنی ایک منفرد شناخت بنا لی ہے۔ ان کا کلام نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ دیگر ممالک سے شائع ہونے والے اردو اور ہندی اخبارات ورسائل کی بھی زینت بننے لگا ہے۔ وہ عمدہ غزلیں تو کہتے ہی ہیں مگر ساتھ میں خوبصورت آواز بھی پائی ہے اور جب غزل پیش کرتے ہیں تو ایک سماں سا بندھ جاتا ہے۔ چنانچہ مشاعروں میں بطورِ خاص انھیں مدعو کیا جاتا ہے۔ اب تک وہ متعدد مقامی، صوبائی اور کل ہند مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ اس قلیل عرصے میں انھوں نے زبان وادب کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ واقعی سراہے جانے کے لائق ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کے اعتراف میں مختلف ادبی اور ثقافتی اداروں کی جانب سے نوازے بھی جا چکے ہیں۔ اب تک کی کارکردگی کے پیشِ نظر ان کے روشن مستقبل کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

اس جواں فکر شاعر کا گوشہ شائع کرتے ہوئے ہمیں دلی مسرت ہو رہی ہے۔ قارئینِ کرام سے گزارش ہے کہ اس گوشے کے متعلق اپنی مفید آرا سے موصوف کو نوازیں۔

سید نفیس دسنوی

منیر سیفی
سمن پورہ، پٹنہ-۱۴
موبائل-09835268274

دل کا شاعر غلام سرور ہاشمی

رِگ وید کے ۳/ حصے ہیں۔جکوبی نے پہلے حصے کو ۴۵۰۰ ق م کی تخلیق کہا ہے۔میکس مولر نے پہلے حصے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس پہلے حصے کو چھند کا دور کہا ہے کہ اس میں شاعرانہ انداز زیادہ نمایاں ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔

سید ظفر ہاشمی مدیر گلبن نے مئی۔جون ۲۰۱۶ء کے اداریہ ''بھائی کس کے پاس پڑھنے کا ٹائم کہاں ہے'' میں سوال اُٹھایا ہے کہ ''یہ ۸۰/کا معنی کیا ہے؟ کوئی بتائے لیکن کسی نے بھی اب تک نہیں بتایا کہ ۸۰/کٹ آوٹ ڈیت کی معنویت اور اہمیت کیا ہے اور یہ اصطلاح کیوں رائج ہوئی کہ ہر ہمہ شما جو افسانوں (میں یہاں شاعری بھی جوڑنا چاہوں گا۔منیر) کی بات کرتا ہے اس منتر کا جاپ ضرور کرتا ہے اور اکیسویں صدی میں باکس آفس ہٹ کرنے والے افسانہ نگار اور تجربات کی روپہلی سنہری اور اودی بھٹیوں سے طرح طرح کی اصناف نکالنے والے فن کار اپنی چھوٹی موٹی اینچا تانی تخلیقات گن سکتے ہیں گنا بھی سکتے ہیں' اسے زندہ جاوید نہیں کر سکتے۔اس کی مثال صابن کی اس بلبلے کی سی ہے جسے چھوٹے بچے نلکیوں سے پھونک کر ہوا میں اُڑاتے ہیں انھیں گنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔پھر نلکی پھینک کر دوسرے کھیل کھیلنے لگتے ہیں اور بلبلوں کو جو نلکی سے نکلتے ہی پھوٹ چکے ہوتے ہیں انھیں بھول جاتے ہیں''۔

اس تمہید کے ساتھ میں ایک بالکل نوجوان تازہ کار شاعر کا تعارف کرادوں۔غلام سرور ہاشمی (۸/جون ۱۹۸۳ء) بہار کے ضلع گوپال گنج میں عالم وجود میں آئے۔انگریزی اور اردو میں ایم اے ہیں۔بی ایڈ اور سنگیت میں ڈپلوما کیا اور درس و تدریس جیسے شاہانہ کام سے جُڑ گئے۔ہاشمی صاحب بچوں کو انگریزی اور اردو کی مفت تعلیم بھی دیتے ہیں جو ایک بڑا اور اہم کام ہے۔تادم تحریر موصوف کی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی ہے۔یہاں میں ان کے چند اشعار کے تعلق سے بات کرنا چاہوں گا۔

تمھارے بن مجھے شام وسحر اب
کسی پہلو سکون دل نہیں ہے
اس کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے
دل کو جب آئینہ بناتا ہوں

دل سے تم آواز دو آجاؤں گا
میں کسی کا دل دُکھا سکتا نہیں
دیکھنے کی دل میں خواہش ہے مجھے اس تاج کی
کون جانے کب مقدر آگرہ لے جائے گا

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ غلام سرور ہاشمی جمالیات کے شاعر ہیں اور جمالیات کا تصور حساس دل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ہاشمی دل کی بات مانتے ہیں اس لئے ان کے یہاں تصنع نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔جو دل پر گزرتی ہے اسے من وعن قرطاس پر اُتار دیتے ہیں۔اگر دل بے حس ہوجائے تو نظام نظم عالم درہم وبرہم ہوجائے۔یہ دل ہی کی وسعت ہے جس کے گوشے میں غموں کے سمندروں کی سمائی ہوجاتی ہے۔

بلا کی موج نے گھیرا ہے مجھ کو۔مری قسمت میں کیا ساحل نہیں ہے

مشکلوں اور مصیبتوں کے بعد جب ساحل ملتا ہے تو اس کی لذت کچھ اور ہی ہوتی ہے جسے الفاظ کا جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے۔ویسے بھی ہاشمی جیسے نوجوان شاعر کو جگر کے شعر کے مصداق موج بلا کو موج انبساط میں ڈھال دینا چاہئے:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

ہاشمی مستقبل میں مشاعرہ باز شاعروں کی نقالی' جگالی اور اینچا تانی تخلیق سے اجتناب کریں تو یقیناً شہرت ان کے قدم چومے گی۔میرا مشورہ ہے کہ اساتذہ نیز معتبر شعراء شکیب جلالی' ناصر کاظمی' سلیمان اریب''،کلیم عاجز' ندا فاضلی' کمار دشینت کو پڑھیں اور انگریزی ادب کا بھی مطالعہ کریں تو تابناک مستقبل کی ضمانت دی جاسکتی ہے کہ ان کے ہاں فرسودگی نہیں ہے اور نئے امکانات عکس ریز ہیں۔ان کی شاعری نلکیوں سے نکلے ہوئے بلبلے نہیں ہیں جو ہواؤں کے رابطے میں آتے ہی پھوٹ جاتے ہیں بلکہ ان کی شاعری کا چراغ ان شاء اللہ طوفانوں میں بھی روشن رہے گا۔(آمین)۔انھیں کے ایک شعر کا حوالہ دے کر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔

جو مشہور کردے مجھے اس جہاں میں
میں اپنے لئے وہ ہنر چاہتا ہوں

☆☆☆
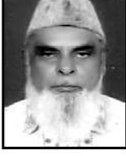
صابرادیب
۳۵رگل کدہ، بالمقابل کچی مسجد،
شاہجہان آباد، بھوپال۔۴۶۲۰۰۱

سادگی اور پُر کاری کا شاعر غلام سرور ہاشمی

کچھ بھی نہ ساتھ جائے گا ایمان کے سوا
تم اپنی خواہشوں کی یہ چادر سمیٹ لو

درس وتدریس سے جُڑے ایک ایسے شاعر کا یہ شعر ہے جسے ادبی دنیا میں غلام سرور ہاشمی کے نام سے لوگ جانتے پہچانتے ہیں۔ بہار کے گوپال گنج میں ۸رجون ۱۹۸۳ء کو آپ ایک ہاشمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعروادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور پھر ان کا یہ لگاؤ ذوق وشوق کی منزلیں طے کرتا ہوا با قاعدہ ۱۹۹۹ء سے شاعری سے جُڑ گیا۔ دل میں لگن تھی، زبان وادب کے تئیں خلوص و جانفشانی تھی اس لئے تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے آج اُس منزل پر متمکن ہیں جہاں فن کار کی اپنی ایک پہچان وشناخت ہوتی ہے۔ متعدد مشاعروں میں شرکت اور خوش لحنی سے انھوں نے اپنی ایک خاص پہچان بنائی ہے۔ پھر بھی ان کی خواہش ہے ؎

جو مشہور کردے مجھے اس جہاں میں
میں اپنے لئے وہ ہنر چاہتا ہوں

اپنے لئے فن کاری یا ہنر چاہنا فن کار کا کوئی غیر فطری عمل نہیں ہوتا۔ فن کار اور شاعر کی فطرت ہی گنجینۂ مخفی ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پہچانا جائے۔ اس کی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف واحترام کیا جائے۔

دراصل یہی وہ جذبہ ہوتا ہے جو اسے تخلیق عمل کی جانب مائل کرتا ہے۔ تخلیق عمل تخّیل کی ایک ایسی عجیب قوت ہے جس کا ماخذ لاشعور میں محفوظ احساسات، تجربات ومشاہدات اور معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے جو شاعر کے ذہن سے نکل کر الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر معنی ومفہوم کو اختیار کر کے عالمِ وجود میں آتا ہے۔ ثبوت کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

کس لئے کرتا ہے تو یوں اپنی طاقت پر غرور
وقت کا قزاق تیری ہر ادا لے جائے گا

☆

کبھی خوشیاں کبھی درد والم کا ساتھ رہتا ہے
کبھی یکساں نہیں رہتی ہے یہ تقدیر مدت تک

قاتل نہیں ہے اور گناہ گار بھی نہیں۔ اس کو سزا ملی جو خطاوار بھی نہیں

آگ نفرت کی لگا دیتے ہیں دنیا میں یہی
زہر آلود خیالات سے جی ڈرتا ہے

علم انسان کو عقل دیتا ہے مگر جوش وجذبہ جس کے بغیر عقل کے تمام کام ناتمام رہ جاتے ہیں، ادب سے ہی آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

کسی کے دل میں نفرت اور حسد باقی نہ رہ جائے
سبھوں کو پیار سے باہم ملانے کی ضرورت ہے

☆

اگر کردار کو اپنے سنوارو گے تو دنیا میں
ملے گی تم کو بھی سرور یہاں توقیر مدت تک

☆

ہم روایت کے امیں آج جہاں میں سرور
اپنے اجداد کی دستار بچانے نکلے

غلام سرور صاحب نے دردمندی، جذبوں کے خلوص اور زندگی کے سوز و گداز کو اچھی طرح محسوس کیا ہے اور اپنی شاعری میں ان کا اظہار بھی کیا ہے۔ اپنوں کی بیگانہ روی، دوستوں کی بے وفائی، ساتھ ہی اپنوں اور غیروں کے قتل وخون کے عناصر کی جھلک بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار دیکھئے اور ان کا سدباب بھی ملاحظہ کیجئے ؎

عجیب بات ہے ہم جن سے پیار کرتے ہیں
ہمارے دل میں وہ خنجر چلائے جاتے ہیں

☆

یوں تو مل جاتے ہیں دنیا میں بہت دوست مگر
کوئی ملتا ہی نہیں ساتھ نبھانے والا

☆

حق کا پرچم لئے ہاتھوں میں وہی آلِ رسول
اپنے ہی خون کے دریا میں نہانے نکلے

تاریکیاں جہاں کی مٹانے کا سوچ کر
دل میں چراغِ عزم جلانا پڑا مجھے
دل کا سکون لوگوں کو دینے کے واسطے
خود چھاؤں بن کے دھوپ میں جانا پڑا مجھے

شاعر موصوف نے جہاں گلے شکوے‘ نفرت اور دشمنی کی بات کی ہے وہیں پیار و محبت‘ عزم و حوصلہ اور قسمت کی بھی بات کی ہے۔ جس سے ان کی بیدار حسیت اور صلابتِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ کہیں کہیں درونِ ذات کی بے کراں ویرانیاں بھی ان کی شاعری میں سایہ فگن ہو جاتی ہیں۔ جیسے یہ شعر:۔

تمھارے بن مجھے شام و سحر اب
کسی پہلو سکونِ دل نہیں ہے

☆

کہنے کے لئے اپنے ہزاروں تو ہیں مگر
مشکل میں کوئی اپنا مددگار نہیں ہے

☆

شہر میں بہتے لہو کی ندیوں کو دیکھ کر
دل کھنچا جاتا ہے اپنا آج صحرا کی طرف

☆

مطلبی دنیا کے سارے لوگ بھی ہیں مطلبی
دل لگا کے ان سے سرورؔ کیا بھلا لے جاؤں گا

☆

راہ میں پھول بچھاتا رہا جن کی ہر دم
میرے رستے میں وہی کانٹے بچھانے نکلے

کہتے ہیں ماں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے شاعروں نے ماں کی عظمت و حرمت اور اس کے ساتھ ہی اس کو ستانے‘ پریشان کرنے‘ دل دُکھانے کے تعلق سے شعر کہے ہیں۔ سرورؔ صاحب بھی شاعر کے اس منصب سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں ۔

یوں ماں کی دعا کرتی ہے سر پر مرے سایہ
نزدیک مرے کوئی بلا تک نہیں آتی

☆

سرورؔ تمھارے ساتھ ہوں گر ماں کی دعائیں
منزل کو پانا کوئی دشوار نہیں ہے

☆

ظلم ڈھا کر جس نے بھی ماں کو پریشاں کر دیا۔ اس نے اپنے واسطے دوزخ کا ساماں کر دیا

آخر میں انھیں کے دو نعتیہ اشعار پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔

یہ مرے آقا کی چشمِ فیض کا ہے معجزہ
جس بیاباں پر بھی نظر ڈالی گلستاں کر دیا
یہ بھی ہے تسلیم سرورؔ دے کے پیغامِ وفا
آدمی وحشی تھا پہلے اس کو انساں کر دیا

☆☆☆

ایک غزل

ملو کسی سے تو پہلے سلام ہو جائے
پھر اس کے بعد مکمل کلام ہو جائے

غزل کے فن سے کیا آشنا مجھے جس نے
اسی کا دل سے مرے احترام ہو جائے

غزل کے ملک میں آیا ہوں آرزو لے کر
خدا کرے مجھے حاصل مقام ہو جائے

یہ ہو گا میرے لئے افتخار کا باعث
اگر وہ مجھ سے کبھی ہم کلام ہو جائے

سلام اس کو کرے گا زمانہ اے سرورؔ
جو سچے دل سے نبی کا غلام ہو جائے

ایم۔نصراللہ نصر
Mob:9339976034

غزل کو آئینہ بنانے والے شاعر۔غلام سرور ہاشمی

اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ شعر و ادب کا تعلق آئینے سے ہوتا ہے۔شاعر یا ادیب جو اپنی تخلیقات پیش کرتا ہے قاری اس میں اپنی زندگی کے لمحات وتجربات کو دیکھنا پسند کرتا ہے۔اگر اس کی زندگی کے حالات و معاملات کی عکس ریزی نظر آتی ہے تو وہ تخلیق اسے زیادہ پسند آتی ہے۔چونکہ شاعر و ادیب کے علاوہ انسان کے دکھ درد کا تذکرہ بھی اس کی تخلیقات کے موضوعات ہوتے ہیں اس لئے اس میں ہر قاری اپنی حیات وجذبات کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔لہٰذا شاعری بھی ایک آئینہ ہے۔غزل تو مکمل آئینہ ہے ہی جس کی وجہ سے شاعر کو کہنا پڑا کہ:

سرور دکھانا تھا مجھے چہرہ ہر ایک کا
آئینہ ہر غزل کو بنانا پڑا مجھے

اس عمل میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا مختصر تجزیہ حاضر خدمت ہے ملاحظہ فرمائیں۔جس طرح دنیا میں مختلف شکل و شباہت کے لوگ ہوتے ہیں۔مختلف عادات واطوار رکھتے ہیں،متعدد مسائل ان کو درپیش ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح غزل کے مختلف اشعار بھی الگ الگ معنیٰ و مفاہیم کے پیکر میں ڈھلے ہوتے ہیں جن کے مطالعے کے بعد ایک غزل میں کئی چہرے عکس ریز ہو جاتے ہیں۔کئی حقائق سطح آئینہ پر ابھر آتے ہیں۔اس پس منظر میں شاعر کی کاوش وفکر ملاحظہ فرمائیں:

گلے شکوے کو اب دل سے بھلانے کی ضرورت ہے
دلوں میں ایکتا پھر سے جگانے کی ضرورت ہے
رہے ہندو،مسلماں،سکھ عیسائی میں نہ کچھ دوری
محبت کا حسیں گلشن کھلانے کی ضرورت ہے

مذکورہ اشعار وطن پرستی اور قومی شاعری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ایسے اشعار کی ان کے یہاں کمی نہیں۔یہ شاعر کی تخلیق کا ایک چہرہ ہے جس میں وہ اپنے ملک کے بکھرتے شیرازہ کو دیکھ رہا ہے۔لوگوں میں پھیلی منافرت اس کے سامنے ہے۔آپسی بھائی چارہ کی عدم موجودگی،قومی ایکتا کی کمی،ذاتی واد،مسلکی تناؤ،مذہبی جھگڑے اور سیاسی بازیگری سب کچھ اس کے شیشۂ شاعری میں نظر آتے ہیں۔اس کی خواہش ہے کہ جس طرح ہندستانیوں (ہندو،سکھ اور مسلمانوں) نے ملک کی سالمیت اور سلامتی کے لئے ایک ہو کر جدو جہد کی تھی،شہادتیں دی تھیں۔جن کے اتحاد و اتفاق سے ملک آزاد ہوا لیکن آج پھر سے ملک منافرت کا غلام ہوتے جارہا ہے۔یکتا کا شیرازہ بکھرتا جارہا ہے۔دلوں میں رقابت کی گرد بیٹھتی جارہی ہے۔اس کے لئے وہ حد سے زیادہ فکرمند ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

ہمارے ملک کی تہذیب جو قائم ہے صدیوں سے
اسے ہر حال میں ہم کو بچانے کی ضرورت ہے
کسی کے دل میں نفرت اور حسد باقی نہ رہ جائے
سبھوں کو پیار سے باہم ملانے کی ضرورت ہے

موصوف کی شاعری کا دوسرا پہلو پند و نصائح کی تشہیر و تبلیغ ہے جس کو نہایت ہی سلیقے سے کہنے کی کوشش کی ہے۔یہ شیوہ تقریباً ہر شاعر کا رہا ہے۔سبھی نے اپنے اشعار میں قوم و ملت کو،بچوں اور بزرگوں کو اور راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے ایسے اشعار کہے ہیں۔موصوف کے اشعار بھی ملاحظہ کریں اور یہ دیکھیں کہ انھوں کس طرح سماج اور معاشرہ کو آئینہ دکھانے کا عمل کیا ہے۔:

کبھی خوشیاں کبھی درد والم کا ساتھ رہتا ہے
کبھی یکساں نہیں رہتی ہے یہ تقدیر مدت تک
اگر کردار کو اپنے سنوارو گے تو دنیا میں
ملے گی تم کو بھی سرور یہاں توقیر مدت تک

☆

وقت مٹھی سے نکل جائے گا بالو کی طرح
ہوش میں آ ذرا یوں وقت گنوانے والے
ایک اک پل کی کر و قدر ہمیشہ سرور
پھر نہ آئیں گے یہ لمحے کبھی جانے والے

رومانیت شاعری کا موضوع ارتکاز رہی ہے۔شاعر کی شاعری کا اکثر آغاز بھی اسی مضمون بندی سے ہوتا ہے۔پہلے وہ عشقیہ اشعار کہتا ہے پھر دھیرے دھیرے حالات ومشاہدات کو موضوعِ بحث بناتا ہے۔لیکن رومانیت کی پاسداری میں 'قلم توڑ سیاہی پی جا' والی بات خوب ہوتی ہے سو سرور صاحب نے

بھی اس عمل سے گزرنے کی پوری کوشش کی ہے جس کی پذیرائی بھی ہونی چاہئے۔اشعار ملاحظہ کریں:

مرے دل سے تری چاہت کا مٹنا غیر ممکن ہے
رہے گی میری آنکھوں میں تری تصویر مدت تک

☆

تم مجھے دل سے بھلا دو یہ تمہاری مرضی
میں نہیں تم کو کبھی دل سے بھلانے والا
اک نظر ہی تجھے دیکھا ہے مگر جانِ جگر
مجھ کو لگتا ہے کہ برسوں سے ہے ناطہ اپنا

ان کے علاوہ شاعر کی شاعری میں تلمیحی تخلیقات کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس عمل میں بھی وہ ثابت قدم نکلے ہیں اور شائستگی و شگفتگی کے ساتھ اپنی بات کہنے کی پوری کوشش کی ہے۔تلمیحی اشعار کی بنت کاری میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ تیر نشانے پر لگے۔ذرا سی چوک معاملے کو درہم برہم کر سکتی ہے۔لیکن سرور صاحب نے احتیاط اور ہوشمندی کا دامن چھوڑا نہیں ہے اور سلیقے سے اپنی بات صفحۂ قرطاس پر سجادی ہے۔مشاہدہ کریں:

کفر کی تاریکیاں بڑھنے لگیں دنیا میں جب
نورِ حق سے آپ نے ہر سو چراغاں کر دیا

☆

حق کا پرچم لئے ہاتھوں میں وہی آلِ رسول
اپنے ہی خون کے دریا میں نہانے نکلے

عصری آگہی کا اکثر ذکر آتا ہے جس میں شاعر اپنے سیاسی' سماجی' تہذیبی اور معاشرتی مشاہدے کا تذکرہ لفظوں کی خوبصورت آویزش سے منعکس کرتا ہے جسے پڑھ کر یا سن کر قاری اور سامع جھوم اٹھتا ہے۔یا پھر دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔اس میں تلخ حقائق کا اظہار اس سلیقے سے کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر سیدھے دل پر ہوتا ہے۔جو گھائل بھی کرتا ہے اور سرور بھی فراہم کرتا ہے۔اشعار ملاحظہ کریں:

کہنے کے لئے اپنے ہزاروں تو ہیں مگر
مشکل میں اپنا کوئی مددگار نہیں ہے

☆

راہ میں پھول بچھاتا رہا جن کی ہر دم
میرے رستے میں وہی کانٹے بچھانے نکلے

☆

قاتل نہیں ہے اور گنہگار نہیں ہے
اس کو سزا ملی جو خطا کار نہیں ہے

اس کے علاوہ بھی سرور ساحب کی شاعری میں بہت کچھ شامل ہے بشرطیکہ انھیں ٹھیک سے پڑھا جائے اور ان کے کلام کو سمجھا جائے۔موصوف نے نعتیہ غزل بھی کہنے کی اچھی کاوش کی ہے۔جس کے ہر شعر میں حضور اقدس کی فضیلت آشکار ہوئی ہے۔ملاحظہ کریں:

کفر کی تاریکیاں بڑھنے لگیں دنیا میں جب
نورِ حق سے آپ نے ہر سو چراغاں کر دیا
اک ہدایت کا صحیفہ ہم کو دے کر آپ نے
امتِ عاصی کی بخشش کا بھی ساماں کر دیا
یہ مرے آقا کی چشمِ فیض کا ہے معجزہ
جس بیاباں پر نظرِ ڈالی گلستاں کر دیا
یہ بھی ہے تسلیم سرور دے کے پیغامِ وفا
آدمی وحشی تھا پہلے اس کو انساں کر دیا

مختصر یہ کہ سرور صاحب کی شعر گوئی کی عمر زیادہ نہیں ہے۔اس لئے پختگی کے لئے کچھ اور آنچ کی ضرورت ہے۔کہیں کہیں خود کو مزید سنوارنے کی طلب بھی ہے۔زبان و بیان پر بھی کچھ اور توجہ چاہئے۔اس کے باوجود ان کے اندر شعر کہنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔اسلوب بھی قابلِ تحسین ہے۔لیکن اسے منزل سمجھ لینا سدِ راہ کا سبب ہوگا۔شاعری محنت' مجاولت' مشاقیت اور بار بار تراش و خراش چاہتی ہے۔غزل کی مرصع سازی میں فصاحت کی مقدار زیادہ ہونے سے غزل کے اشعار کے وقار اور نکھار میں خوبصورت اضافہ ہوتا ہے۔امید ہے وہ اس کا خیال ضرور رکھیں گے۔کچھ اشعار جو نظر ثانی کے طالب ہیں درج ذیل ہیں:

عشق میں پھاڑ دیا جیب و گریباں اپنا
وہ نظر آتے ہیں اب پیار میں پاگل کی طرح

(اس میں فصاحت کی ضرورت ہے)

تم جا چکے جو روٹھ کے مجھ سے مرے رفیق
مدت ہوئی تمہارا سا چارہ نہیں ہے

(فصاحت کی کمی)

تمہارے بن مجھے شام و سحر اب
کسی پہلو سکونِ دل نہیں ہے

(لفظ ہے توجہ طلب ہے)

پھر بھی شاعر کی حوصلہ افزائی لازمی ہے۔اس لئے کہ وہ ابھی شعری سفر کے ابتدائی مرحلے میں ہے۔منزلیں آسان بھی ہوسکتی ہیں۔اس کی تخلیق میں بھی سرخاب کے پر لگ سکتے ہیں۔اس کا مجھے گمان بھی ہے اور یقین بھی۔

☆☆☆

شارق عدیل
At/P.O:Marhera-207401
Dist:Etah-(U.P).

زندگی کا ترجمان شاعر۔غلام سرور ہاشمی

اردو زبان کے شعری گلیاروں میں اگر کوئی مقبول ترین شعری صنف ہے تو وہ بلا مبالغہ غزل ہی ہے۔اس کے کہنے والے لاتعداد ہیں اور سننے والے بھی۔ کیونکہ اس کی دومصرعی اداؤں پر ایک عالم فریفتہ ہے۔

اسی بنا پر اسے مشاعرے کے نام سے رات رات بھر سنا جاتا ہے۔اور واہ واہ کے شور سے نینداس قدر ڈر جاتی ہے کہ آنکھوں میں اُترنے کے خیال سے بھی دور رہتی ہے۔غلام سرور بھی مشاعرے کے بہترین اور کامیاب شاعر ہیں۔ کیونکہ خالقِ ارض وسماء نے انھیں سُریلی آواز کے جادو سے نواز رکھا ہے جو آج کے مشاعرے کی اہم ضرورت میں شامل ہے۔اور اس پر غلام سرور کی غزل سامعین کے دلوں کو اپنی گرفت میں لینے کی غرض سے انسانیت کے پیغام کو اس انداز سے عام کرتی ہے کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ صرف غلام سرور کو ہی سنتے رہیں۔لیکن غلام سرور مشاعرے کی مقبولیت اور شہرت کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے لئے ادبی منظر پر بھی نظر رکھتے ہیں۔اور ادبی رسائل و جرائد کو بھی اپنے مطالعہ میں رکھتے ہیں اور اپنے کلام کی اشاعت سے بھی غافل نہیں رہتے ہیں۔

چونکہ موصوف پڑھے لکھے انسان ہیں درس و تدریس سے وابستہ ہیں اس لئے جب بھی وہ تخلیقی وجدان سے ہمکنار ہوتے ہیں تو صرف محبتیں ہی ان کے احساسات میں گردش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اس کا چہرا ابھرنے لگتا ہے
دل کو جب آئینہ بناتا ہوں
تم مجھے دل سے بھلادو یہ تمھاری مرضی
میں نہیں تم کو کبھی دل سے بھلانے والا

یہ اشعار غزل کی دیرینہ روایت کی امین ہیں اور یوں بھی محبوب کی گلی میں فکر کی گلکاریاں جذبات کی تابع ہی رہا کرتی ہیں۔غلام سرور کی غزل میں وقت کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔اس لئے وہ فضول وقت برباد کرنے والوں سے نالاں نظر آتے ہیں۔کیونکہ آج کے بہت سے نوجوان تعلیمی لمحوں کو بھی واٹس ایپ اور فیس بُک کی نذر کر دیتے ہیں اور ان کا یہ مشغلہ ان کے بہترین مستقبل کی لو کو مدھم کرسکتا ہے۔

وقت مٹھی سے نکل جائے گا بالو کی طرح۔ہوش میں آذرا یوں وقت گنوانے والے
وقت کی قدر کرو دل سے ہمیشہ سرور
کیونکہ یہ وقت نہیں لوٹ کے آنے والا

مذکورہ اشعار کی معنویت اس بات کی گواہ ہے کہ شاعر وقت کی دل سے قدر کرتا ہے اور وہ دوسرے لوگوں کو بھی تاکید کرتا ہے کہ وہ وقت کا احترام کریں اور اس کے پابند رہیں۔شاعر گنگا جمنی تہذیب کی حفاظت پر بھی زور دیتا ہے۔

ہمارے ملک کی تہذیب جو قائم ہے صدیوں سے
اسے ہر حال میں ہم کو بچانے کی ضرورت ہے

غلام سرور کے بعض اشعار ماں کی عظمت و محبت سے بھی تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان کے اشعار پر سامعین داد دینے کے جوش میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ماؤں کے فرماں بردار نظر آتے ہیں۔اس کے باوجود بھی بہت سی مائیں اپنے گھروں میں ناقدری کا زہر پینے پر مجبور ہیں۔

یوں ماں کی دعا کرتی ہے سر پر مرے سایا
نزدیک مرے کوئی بلا تک نہیں آتی
سرور تمھارے ساتھ ہوں گر ماں کی دعائیں
منزل کو پانا پھر کوئی دشوار نہیں ہے

غلام سرور کی غزل زندگی کے حقیقی رنگوں سے عبارت ہے۔اس لئے وہ اپنے عہد کے انسانوں کو زندگی کے اصل مقاصد سے باخبر کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور صداقت سے انحراف کرنے والے اس دور میں یہ شعری عمل قابلِ قدر ہے۔

دل کا سکون لوگوں کو دینے کے واسطے۔خود چھاؤں بن کے دھوپ میں جانا پڑا مجھے
آگ نفرت کی لگا دیتے ہیں دنیا میں یہی۔زہر آلودہ خیالات سے جی ڈرتا ہے
کرتے رہے جو دشمنی ہر وقت میرے ساتھ۔ میں ان کی مشکلوں میں مددگار ہو گیا
ہم کو نگاہِ بد سے بچانا تو اے خدا۔حالت ہمارے ملک کی ہموار نہیں ہے

ان اشعار کی معنی کی دشائیں مختلف ضرور ہیں لیکن شاعر اپنے ہر شعر میں انسانیت کا علمبردار ہی نظر آتا ہے۔غلام سرور کی شاعری میں محسنِ انسانیت رسول اکرمؐ اور ان کے خاندان والوں سے محبت و عقیدت کے جذبات بھی پوری ایمانی

کیفیت کے ساتھ فروزاں ہوتے ہیں۔ دو مثالیں دیکھئے:

یہ مرے آقا کی چشمِ فیض کا ہے معجزہ
جس بیاباں پر نظر ڈالی گلستاں کر دیا

حق کا پرچم لئے ہاتھوں میں وہی آلِ رسول
اپنے ہی خون کے دریا میں نہانے نکلے

غلام سرور کی غزل میں میل ملاپ کی جو خوشبوئیں ہیں وہ انتقام و مایوسی جیسے فضول جذبوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ہیں۔ کیونکہ زندگی نفرت کے اندھیرے میں اپنی معنویت سے بیگانہ ہو جاتی ہے اور انسان کو وحشی اور درندوں کی صفت میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے جو غلام سرور کی انسانیت پسند فطرت کے منافی ہے۔ اس لئے وہ اپنی شاعری میں امن و سلامتی کے پیغامبر کی صورت میں ہی نظر آتے ہیں۔

اس وقت اردو زبان کے تخلیقی علاقوں میں صوبۂ بہار کے قلم کاروں کی ذہانت ہر ادبی شعبے میں اپنے ہونے پر اصرار کر رہی ہے اور غلام سرور بھی گوپال گنج (بہار) کی ادب پرور مٹی کی ہی پیداوار ہیں' اس لئے ان کے مستقبل میں مزید بہتر شاعری کی امید کی جا سکتی ہے۔☆☆☆

(بقیہ دلوں کے داغ چھپاؤ)

مگر امی جان کے کان پر جوں نہیں رینگی وہ ماحول سے بے نیاز بن کر آئے ہوئے میرے عید کے کپڑے انہماک تہہ کرتی رہیں۔ آداب پھوپھی جان.....!

دُلہن آپا ایک ہاتھ سے بچے کو تھامے دوسرے ہاتھ سے ساس کے پاؤں چھونے کو جھکیں' مگر انھوں نے کوئی جواب دئے بغیر اپنے پاؤں اس طرح سمیٹ لئے جیسے کسی گندگی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند لمحے خاموشی رہی' پھر اس کڑوی کسیلی خاموشی میں سلمان بھائی کی بھرائی ہوئی آواز گونجی، امی جان! میں تو یہی سمجھ کر آیا تھا کہ آپ پُرانی تلخیاں بھلا چکی ہوں گی' میں آپ کے لئے بیٹا نہ سہی مگر آپ میرے لئے ماں ضرور ہیں۔ میں یہاں اپنی امی سے ملنے آیا تھا مگر آپ کی سرد مہری اور بے اعتنائی نے میرے حوصلے پست کر دئے ہیں، لہٰذا اب اپنا ارادہ بدل دینے پر مجبور ہو گیا ہوں، میں ابھی چند منٹ میں آپ تمام کی دعائیں لے کر لوٹ جاؤں گا۔ جواب میں ایک خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا مگر امی کے ہاتھ ضرور گئے تھے۔

امی جان! سلمان بھائی کی آواز پھر آئی۔ کاش آپ اپنا غصہ بھول کر اپنے فیصلے پر ٹھنڈے دل سے نظر ثانی کر سکتیں۔ کیا ایک بھائی کی احمقانہ حرکت سے پیدا شدہ تلخی اور رنجش کا ناطہ اپنی اولاد کی خواہشات اور تمناؤں سے جوڑ کر حالات کو مزید بگاڑا جا سکتا ہے۔ کیا ایک جہاں دیدہ بزرگ اور شفیق ماں سے اپنے بیٹے کے لئے ایسے انتہائی اقدام کی امید کی جا سکتی ہے۔ لوگ دنیا میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' کہیں کسی کے زخم اس طرح سدا ہرے نہیں رہتے' زمانہ سب سے بڑا حکیم ہے جو گہرے سے گہرے زخم مندمل کر دیتا ہے' لیکن آپ جان بوجھ کر اپنے زخموں ہرا رکھنے پر تل گئی ہیں' آپ تنگ نظری کو خیرباد کہہ کر فراخ دلی کو اپنائیں۔ دنیا میں اچھے لوگوں کے انمنٹ نقوش بن کر ہمیشہ باقی رہتے ہیں' جنھیں ان کی آئندہ نسلیں سر آنکھوں سے لگاتی ہیں اور ان کے تقدس کو زندہ رکھتی ہیں' کیا آپ ایسی ہی ایک روشن مثال قائم نہیں کریں گی؟

ٹپ.....! ایک لرزتی کانپتی بوند امی کی آنکھ سے ٹپکی اور ان کے دوپٹے میں جذب ہو گئی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اپنے فیصلے پر آج بھی اسی طرح اٹل رہو گی اور میں اتنا بدنصیب ہوں گا' کوئی بھی ماں اپنے بچے کی ایک دن کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن دو برس گزر جانے کے باوجود اپنے خاطی اور نادان بیٹے کو معاف کرنا تو درکنار اس کی صورت تک کی روادار نہیں ہوئیں۔ چلئے میں گناہ گار سہی اور میرا جرم ناقابل معافی سہی لیکن کم از کم معصوم اور بے گناہ پوتے کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کے دو بول ضرور کہہ دیں کہ اس کا نصیب ہم جیسوں کا سا نہ ہو۔ یہ کہہ کر سلمان بھائی نے آپا کو شارہ کیا انھوں نے آگے بڑھ کر آٹھ ماہ کے بچے کو امی کے گود میں ڈال دیا۔ امی جیسے گہرے نیند سے چونکیں۔ انھیں غالباً اس اچانک اقدام کی توقع نہ تھی۔ لاشعوری طور پر ان کے ہاتھوں نے بچے کو تھام لیا' اگلے ہی لمحے وہ چیخ اٹھیں اے دور ہو' میرے کپڑے ناپاک کر دے گا۔ ارے سنبھالو اسے.....!

مگر کسی کے سنبھالنے سے پہلے ہی خاموش ہو کر ٹکٹکی لگائے بچے کو تکنے لگیں۔ بچہ خود بھی ان کی طرف نظر جمائے انھیں تک رہا تھا، دادی کو اس طرح اپنے طرف دیکھتے دیکھتے مسکرایا اور دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

روئی کے گالے جیسے سفید اور پیارے پیارے بچے کو کوثر تسنیم میں دھلی پاک مسکراہٹ' وہ مسکراہٹ جس نے کسی فاتح قوم کی طرح اپنے دشمنوں کی تلواریں نیچی کر دی ہیں۔ جلادوں کے پتھر جیسے موم کر دیتے ہیں، آج اس مسکراہٹ کی تپش نے اس چٹان کو پگھلنے پر مجبور کر دیا تھا جو دو برس تابڑ توڑ ضربوں کے باوجود ایک رتی نہ ٹوٹ سکی تھی۔ کسی کو آگے بڑھ کر بچے کو سنبھالنے سے پہلے ہی میں نے جوش کھائی ہوئی اس موجِ خون کو دیکھا جو دادی کے دل سے پھوٹ نکلی تھی۔ وہ بے اختیار رو بے خود ہو کر اس معصوم فرشتے کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تھام کر چند لمحے اپنی پرنم آنکھوں سے اسے تکتی رہیں۔ پھر اپنے کلیجے سے اس طرح چمٹا لیا جیسے وہ اس کا گم گشتہ ٹکڑا ہو۔ ان کا سارا غصہ اور غضب شفقت کے دھار میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔

سب حیرت و مسرت کے عالم میں اس چٹان کو پگھلتے دیکھتے رہے۔ دفعتاً ابا جان کی آواز اس خاموشی میں گونجی۔ اللہ تیری شان۔ اللہ تیری شان۔ جو کام بڑوں سے برسوں میں نہ ہو سکا اسے ایک شیرخوار بچے نے چٹکیوں میں کر دکھایا، بس اب پُرانی باتیں بھول جاؤ اور خوش رہو۔ بقول شاعر۔ لاحول ولاقوۃ۔ بھلا سا شعر ہے جو ذہن سے اُتر گیا ہے' کمبخت شاعر نے غالباً اسی گھڑی کے لئے کہا تھا۔ بھلا وہ کیا شعر ہے سلمیٰ.....!

میں نے رندھے ہوئے اور جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

دلوں کے داغ چھپاؤ ہنسی کو عام کرو۔ یہ حکم ہے کہ بہاروں کا احترام کرو☆☆☆

عبدالمتین جامیؔ
اردو بازار۔ڈاکخانہ پدماپور
ضلع۔کٹک
موبائل۔9938905926

غلام سرور اپنی شاعری کے آئینے میں

ہاشمی خاندان کے چشم و چراغ یہ تازہ کار شاعر ۸؍جون ۱۹۸۳ء کو گوپال گنج بہار میں پیدا ہوئے۔تعلیم ایم اے تک حاصل کی۔سرِ دست درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔موصوف نے ۱۹۹۹ء میں جس وقت کہ مابعد جدید کا عہد تقریباً ختم ہونے کو تھا شاعری شروع کی۔لیکن حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے گزشتہ دو دہائیوں میں بے پناہ مشق ومزاولت کی وجہ سے شاعری کے رموز ونکات سے کافی حد تک معلومات حاصل کر لی ہیں۔ان کی شاعری کے چند حصے جو ہمارے ہاتھ لگے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ ان کو ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔یوں تو وہ ہندوستان کے مختلف ادبی رسائل میں بلا ناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ مزید مشق سخن کی منازل سے آگے نکل چکے ہیں۔بہر حال بہت ہی سُریلی آواز کے مالک غلام سرور ہاشمی فی الواقع مشاعروں کی روح رواں سمجھے جاتے ہیں۔لیکن مشاعروں میں بے انتہا کامیاب شاعر کبھی کبھی سنجیدہ ادباء و شعراء کی نظر میں مقام بنانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔بطور خاص فی زمانہ مشاعروں کا جو حال ہے یا جو معیار ہے اس کے مطابق گزشتہ دہائیوں کے مشاعرہ باز شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے ان مشاعروں کو منفی رخ دے دیا ہے۔مرحوم بیکل اُتساہی کے علاوہ مزید کئی شعراء جو اپنے عہد کے کامیاب فن کار کہلاتے تھے موجودہ دور کے مشاعروں کے رنگ وڈھنگ سے نالاں رہے تھے متعدد ادبی رسائل وجرائد میں ان نوٹنکی مشاعروں اوران کا انعقاد کرنے والے منتظمین غیر ادبی کارکردگی کو منظرِ عام پر لا چکے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔کئی حضرات تو یہاں تک کہتے نظر آتے ہیں کہ مشاعرہ باز شعرا دوسروں سے کلام لکھوا کے اپنے ترنّم کا جادو جگاتے ہیں اور ہزاروں روپے اینٹھ لیتے ہیں۔بعض شعرا یا شاعرہ دیوناگری رسم الخط میں کلام لکھوا کر مشاعروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ان باتوں کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان و ادب نیز اردو کی تہذیب کے لئے یہ رجحان سم قاتل سے کم نہیں ہے۔بہر کیف ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ غلام سرور مذکورہ بالا مشاعرہ باز شاعروں میں سے نہیں ہیں بلکہ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اپنے ہی بل پر لکھتے ہیں۔نت نئے خیالات کو اپنی پیش کردہ شاعری کا موضوع بنا کر اردو شاعری کو مزید مالا مال کرنے میں مصروف ہیں۔مجھے سعید رحمانی صاحب (مدیر اعلی ادبی محاذ کٹک) کے توسط سے غلام سرور صاحب کی غزلوں کے چند اشعار دیکھنے کو ملے۔یہ بات سچ ہے کہ صرف ۱۴؍۱۵؍ غزلوں کے مطالعہ سے کسی شاعر کی شاعری کے رجحان کا مکمل احاطہ ممکن نہیں ہے۔تاہم میرے مطالعہ میں آئی ہوئی غزلوں میں شاذ و نادر ہی ایسے اشعار ملے جن کو مشاعرہ باز شاعروں کے چربہ سمجھا جائے۔

اکیسویں صدی کی شاعری میں ابھرنے والے تقریباً سبھی رجحانات موصوف کی شاعری میں موجود نظر آئے۔یعنی اکیسویں صدی کی شاعری میں نہ ہی مکمل طور پر جدیدیت حاوی ہے اور نہ ہی ترقی پسندی' بلکہ موجودہ دور میں پیش آنے والے تمام مسائل کا ذکر آج کی شاعری پر حاوی نظر آتا ہے۔اس صدی کی شاعری میں جہاں فرقہ پرستی کا ذکر ملتا ہے وہیں فرقہ پرستی کے خلاف احتجاج کا لہجہ بھی سامنے آجاتا ہے۔قدم قدم پر منڈلاتے مختلف نوع کے خطرات کا ذکر ملتا ہے وہیں کسی غیبی طاقت پر ایمان کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے جس کے زیر سایہ مایوس انسان کو بھی نئی زندگی جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔

جدیدیت کے تمام بڑے رجحانات میں سے ایک بہت ہی مذموم رجحان دہریت کا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے شعرا اس سے اجتناب برتنے لگے ہیں۔گزشتہ صدی میں بعض دہریت پسند عناصر نے لکھ دیا تھا کہ ''نعوذ باللہ'' خدا کی موت ہوگئی ہے۔لیکن اکیسویں صدی میں ان دہریوں میں بھی مذہبی رجحانات کا احیا ہونے لگا ہے۔ہم فی الحال امریکہ سے لے کر یورپ' افریقہ اور ایشیا کے تمام ممالک کے عوام میں مذہبی بیداری کا رجحان دیکھ رہے ہیں۔مگر افسوس کی بات ہے کہ یہی رجحانات اقوام کو ایک ڈور میں باندھنے کے بجائے ایک دوسرے کے مدِ مقابل کھڑا کر رہے ہیں۔ہر قوم میں انتہا پسندی اپنے عروج پر نظر آنے لگی ہے۔نتیجتاً ہر جگہ انتشار پسندی کا رجحان سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

اکیسویں صدی میں کی جانے والی شاعری میں ان باتوں کا اثر پڑنا ہی تھا سو پڑ رہا ہے۔ہر کوئی اللہ کے دربار میں دست بستہ دعا کر رہا ہے اور بعض لوگ سارے مصائب سے بچنے کے لئے ماں کی دعا کا سہارا لے رہے ہیں۔امن وامان کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ بین الاقوامی سطح پر برادرانہ تعلقات استوار ہوں۔دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بھی مل جاتا ہے' آخرت اور جنت کا ذکر بھی۔ان تمام باتوں سے یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں میں کچھ مثبت سوچ جگہ لے رہی ہے' ٹھیک ہے لیکن ان مثبت سوچوں کا

جس فن کارانہ انداز سے اظہار ہونا چاہئے وہ تقریباً ہو نہیں پا رہا ہے۔

میں نے غلام سرور ہاشمی کی شاعری میں کچھ نئی باتوں کا سراغ پایا ہے اس لئے اتنا کچھ لکھ دیا۔ موصوف کے کلام میں ناصحانہ انداز بھی پایا جاتا ہے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ شاعری کو پند و نصائح کا پٹارہ بنا دینا شاعری کی روح کو مجروح کرتا ہے۔ غلام سرور کے یہاں بھی کچھ ایسے اشعار پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

رہے ہندو مسلماں سکھ عیسائی میں نہ کچھ دوری
محبت کا حسیں گلشن کھلانے کی ضرورت ہے

بات تو اچھی ہے لیکن شاعری اسے کہتے ہیں جو اپنے قارئین کے جذبوں کو برانگیختہ کر دے۔ کیا اس شعر میں اپنے منشا کی کوئی بات ہے؟ یا اس شعر کو لیجیے:

جو ہے خالق ہمارا اور ہے رب دو عالم بھی
اسی کے آستاں پر سر جھکانے کی ضرورت ہے

اس قسم کے اشعار قارئین کے ذہن میں ایک واعظ کو لا کر کھڑا کر دیتے ہیں جو ان کو اپنے واعظ و نصیحت سے ایک جہاں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس یہ شعر اپنے قاری کے دل میں کسک چھوڑنے میں ضرور کامیاب ہوتا ہے کہ:

زندگی کے نحیف کاندھے پر
لاش حسرت کی میں اُٹھاتا ہوں

مرے دل سے تری چاہت کا مٹنا غیر ممکن ہے
رہے گی میری آنکھوں میں تری تصویر مدت تک

مال و زر کی یہ ہوس رکھتا ہے اپنے دل میں کیوں
بعد مرنے کے بتا تو ساتھ کیا لے جائے گا

دل کا سکون لوگوں کو دینے کے واسطے
خود چھاؤں بن کے دھوپ میں جانا پڑا مجھے

مندرجۂ بالا تینوں اشعار یقیناً اپنے سنجیدہ قارئین کے دل میں اثر چھوڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ میں نے مذکورہ بالا سطور میں جس کا ذکر کیا ہے کہ موجودہ دور میں لایقینیت کی صورت حال کے تحت اکثر و بیشتر شعرا ''ماں'' کی دعا کے ذریعہ خدائے واحد کی پناہ کے طلب گار ہوتے ہیں۔ غلام سرور بھی کہتے ہیں:

رہتی ہے سدا ماں کی دعا بن کے محافظ
نزدیک مرے کوئی بلا تک نہیں آتی

یا لوگوں کے دلوں میں عام طور پر پائے جانے والے بغض و عداوت کے جذبوں کے جواب میں آج کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں صلہ رحمی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ سرور صاحب کہتے ہیں:

ہم رسم محبت کو نبھاتے ہی رہیں گے
دشمن کو گلے سے بھی لگاتے ہی رہیں گے

تاہم ان کی شاعری میں کہیں کہیں روایتی موضوعات کے تحت وارداتِ قلبی نیز ہجر و وصال کے جذبے کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ بطور مثال دو شعر کو ہی دیکھیں:

اک نظر ہی مجھے دیکھا ہے مگر جانِ جگر
۔مجھ کو لگتا ہے کہ برسوں سے ہے ناطہ اپنا

عشق میں پھاڑ دیا جیب و گریباں اپنا
وہ نظر آتے ہیں اب پیار میں پاگل کی طرح

موجودہ عہد کی تمام تر ناہمواریوں میں سے بطور خاص آج کی زہریلی فضا ہر کس و ناکس کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ہر طرف انسانی خون کا دریا بہتا نظر آتا ہے۔ ایسے میں ایک حساس شاعر کا دل کیا چاہتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

شہر میں بہتے لہو کی ندیوں کو دیکھ کر
دل کھنچا جاتا ہے اپنا آج صحرا کی طرف

میں ایسے ایک انسان دوست شاعر غلام سرور ہاشمی کے لئے خداوند قدوس سے دعا کرتا ہوں کہ ان کی شاعری اسی طرح ارتقائی منزلیں طے کرتی رہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دینا چاہوں گا کہ وہ مشاعرے میں جو کچھ پڑھیں شعری لطافت کو مجروح نہ ہونے دیں بلکہ اپنی اصلی شاعری کو وہی جہت عطا کریں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں ان کی شاعری فکری صلابت اور بالیدہ نظری کا نمونہ بن جائے گی۔

☆☆☆

سعید رحمانی
مدیرِ اعلیٰ ادبی محاذ۔ دیوان بازار کٹک (اڑیسہ)

غلام سرور ہاشمی کی فکری اڑان

گوپال گنج بہار کی سرزمین سے ابھرنے والے جواں فکر شاعر غلام سرور ہاشمی کا شمار اگرچہ نوواردانِ بساطِ سخن میں کیا جاتا ہے کیونکہ شعری سفر انھوں نے یہی کوئی دس گیارہ سال قبل ہی شروع کیا ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس قلیل عرصے میں انھوں نے ایسی فکری اڑان بھری کہ جلد ہی اپنی مقبولیت کا سکہ جمالیا۔ مقامی، صوبائی اور کل ہند سطح پر ہونے والے مشاعروں میں تو مقبول ہیں ہی ساتھ ہی ملک اور بیرونِ ملک سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل میں بھی ان کا کلام تواتر سے شائع ہونے لگا ہے جس کے سبب وہ ادبی حلقوں میں بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں اور ہر دو حلقے میں یکساں مقبول ہیں۔

صنف غزل ہی انھیں محبوب ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ روایت کی پاسداری عزیز ہے اور ساتھ ہی آج کے بدلتے ہوئے حالات اور عصری تقاضوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کے خام مواد کو جب جذبے کی آگ میں تپا کر لفظوں کی تجسیم کرتے ہیں تو اس کی صورت گری ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان شاعر اپنے ابتدائی سفر میں حسن وعشق اور زلف ورخسار جیسے فرسودہ موضوعات کو ہی اپنی غزلوں کا محور بناتے ہیں۔ غلام سرور کے یہاں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں مگر بہت ہی کم۔ ان کی نظر عہد حاضر کے سلگتے مسائل پر زیادہ مرکوز رہتی ہے۔ چنانچہ بیشتر غزلیں آج کے انہدام پذیر معاشرے کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔

اسلوبیاتی سطح پر سادگی وسلاست کے ساتھ ان کے یہاں گہرائی و گیرائی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہی عصر حاضر کے سلگتے مسائل کی تمازت بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان تلخیوں اور نامرادیوں کے باوجود ان کی اولوالعزمی ان کے بلند عزائم کا پتہ دیتی ہے۔

آج ہم جس بحرانی دور سے گزر رہے ہیں ان میں خاص طور پر ملک کی زہر آلود ہوتی فضا تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اس کی تصویر کشی کے کچھ نمونے ان کے اشعار میں ملاحظہ ہوں:

ہم کو نگاہِ بد سے بچانا تو اے خدا
حالت ہمارے ملک کی ہموار نہیں ہے

آپ نفرت کا اُگانے لگے جنگل ہر سو
بستیاں پیار کی ہم لوگ بسانے نکلے

شہر میں بہتے لہو کی ندّیوں کو دیکھ کر
دل کھنچا جاتا ہے اپنا آج صحرا کی طرف

تمہارے بن مجھے شام وسحراب
کسی پہلو سکونِ دل نہیں ہے

جن کی نیت ہے غریبوں پر ستم ڈھانے کی
دوستوان کے خیالات سے جی ڈرتا ہے

اگر آپس میں یوں لڑتے رہو گے اے وطن والو
غلامی کی رہے گی پاؤں میں زنجیر مدت تک

یہ اور اسی نوعیت کے اشعار جابجا مل جاتے ہیں جن میں انھوں نے متعصب ذہنوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اس کا انجام بھی بتا دیا ہے۔ ساتھ ہی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی دعوت بھی دیتے ہیں کہ اگر ہم مل جل کر رہیں اور تعمیری کاموں پر توجہ دیں تو ہمارا ملک حقیقی معنوں میں ایک شاداب گلشن میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

گلے شکوے کو اب دل سے بھلانے کی ضرورت ہے
دلوں میں ایکتا پھر سے جگانے کی ضرورت ہے

رہے ہندو، مسلماں، سکھ، عیسائی میں نہ کچھ دوری
محبت کا حسیں گلشن کھلانے کی ضرورت ہے

کسی کے دل میں نفرت اور حسد باقی نہ رہ جائے
سبھوں کو پیار سے باہم ملانے کی ضرورت ہے

صالح قدروں کی پامالی آج کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ رشتوں کی حرمت باقی نہیں رہی، دوستی کی آڑ میں دشمنی کا چلن، عدلیہ کی ناانصافی عام ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

راہ میں پھول بچھاتا رہا جن کی ہر دم ۔ میرے رستے میں وہی کانٹے بچھانے نکلے

قاتل نہیں ہے کوئی گناہ گار نہیں ہے
اس کو سزا ملی جو خطا کار نہیں ہے
یوں تو ملتے ہیں زمانے میں بہت دوست مگر
کم ہی ملتے ہیں محبت کو نبھانے والے

آج کی نئی غزل میں دعائیہ اور نعتیہ اشعار کہنے کی روایت بھی چل پڑی ہے۔ اگر چہ روایتی شاعری میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں مگر دور حاضر میں اس روایت کا احیاء ایک نیک شگون ہے۔ اس طرح کے حمدیہ اور دعائیہ اشعار غزل کے فارم میں ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں کیونکہ ان میں غزل کی تمام تر خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ غلام سرور کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کفر کی تاریکیاں بڑھنے لگیں دنیا میں جب۔ نور حق سے آپ نے ہر سو چراغاں کر دیا
یہ مرے آقا کی چشمِ فیض کا ہے معجزہ۔ جس بیاباں پر نظر ڈالی گلستاں کر دیا
ان اندھیروں میں نظر آتی ہیں یہ کرنیں کیسی
کس کے جلوؤں کی جھلک ہے' یہ اُجالا کیا ہے
یہ بھی ہے تسلیم سرورؔ دے کے پیغام وفا۔ آدمی وحشی تھا پہلے اس کو انساں کر دیا

آج کل اردو غزل میں ایسے اشعار کہنے کی روایت چل پڑی ہے جن میں ماں کی عظمت کا بر ملا اظہار ہوتا ہے۔ ماں پر شعر کہنے کی راویت کا آغاز منور رانا سے ہوتا ہے۔ اس کے قبل بھی اگر چہ اس کی مثال پائی جاتی ہے مگر منور رانا نے ماں پر جس پایہ کے اشعار کہے ہیں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ پھر بھی آج کے شعرا اپنے اپنے طور پر ماں کو خراج عقیدت پیش کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ غلام سرور کے یہاں بھی ماں پر بہت سے شعر پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے ماں اور باپ دونوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں ماں کی دعا کرتی ہے سر پر مرے سایہ
نزدیک مرے کوئی بلا تک نہیں آتی
ماں باپ کے جو دل کو دکھاتا ہے ہر گھڑی
دنیا میں اس سے بڑھ کے تو بدکار نہیں ہے
نارِ دوزخ میں اسے جلنا پڑے گا آخر
اپنے ماں باپ کو جو بھی ہے ستانے والا
ماں باپ کی عزت کا جنھیں پاس نہیں ہے۔ وہ بے ادب ہیں ان کو حیا تک نہیں آتی

بعض جگہ انھوں نے اسلامی تلمیحات کو بھی بڑی خوبصورتی سے شعری جامہ عطا کیا ہے مثلاً

حق کا پرچم لئے ہاتھوں میں وہی آلِ رسول
اپنے ہی خون کے دریا میں نہانے نکلے

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جدید ٹکنولوجی نے جو انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کے اچھے برے نتائج ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ خصوصاً انٹرنیٹ سے جہاں بہت ساری سہولیات میسر آئی ہیں وہیں سب سے بڑا نقصان وقت کا زیاں بھی ہے۔ ہماری نئی نسل پرنٹ میڈیا سے دور ہوتی جا رہی ہے اور اپنا زیادہ تر وقت الکٹرونک میڈیا پر صرف کر رہی ہے۔ بعض کو تو اس کا نشہ سا لگ گیا ہے۔ جب دیکھوا پنے کمپیوٹر سے لگے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کا بہت سا وقت ضائع ہوتا ہے۔ اسی بات کے پیش نظر غلام سرور بار بار وقت کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں:

ایک ایک پل کی کرو قدر ہمیشہ سرورؔ۔ پھر نہ آئیں گے یہ لمحے کبھی جانے والے
وقت کی قدر کرو دل سے ہمیشہ سرورؔ۔ کیونکہ یہ وقت نہیں لوٹ کے آنے والا
وقت مٹھی سے نکل جائے گا بالو کی طرح۔ ہوش میں آذرا یوں وقت گنوانے والے

غلام سرور شاعری کی ایک اہم خصوصیت ان کی صالح فکری اور تعمیر پسندی بھی ہے۔ ہمارے معاشرے میں طرح طرح کی برائیاں در آئی ہیں۔ انسان درندہ بن چکا ہے' دوستی کے پردے میں دشمنی عام ہے' علم کی روشنی پھیلنے کے باوجود جہالت کی تاریکیاں غالب نظر آتی ہیں۔ غرض کہ سیاسی' سماجی' اخلاقی سطح پر یہ ناہمواریاں ایک ہوش مند انسان کے لئے لمحۂ فکریہ سے کم نہیں۔ انھیں باتوں کے پیش نظر وہ کہتے ہیں:

تاریکیاں جہاں کی مٹانے کی سوچ کر۔ دل میں چراغ عزم جلانا پڑا مجھے
جس کو میں دوست سمجھتا رہا ہر دم لیکن۔ اک وہی مجھ پہ تھا الزام لگانے والا
راہ میں پھول بچھاتا رہا جن کی ہر دم۔ میرے رستے میں وہی کانٹے بچھانے نکلے
عجیب بات ہے ہم جن سے پیار کرتے ہیں۔ ہمارے دل پہ وہ خنجر چلائے جاتے ہیں

مختصراً کہا جائے تو غلام سرور نے اپنی غزلیہ شاعری کو ایک ایسا آئینہ خانہ بنا دیا ہے جس میں ہمارے معاشرے کی جھلکیاں بھی ہیں اور ہر شخص اپنا چہرہ بھی دیکھ سکتا ہے۔ آج کے زہریلے ماحول نے ملکی حالات کو اس قدر دھماکہ خیز بنا دیا ہے کہ ہر گزرتا پل نئے نئے سانحات و حادثات اپنے ساتھ لے کر آنے لگا ہے۔ اس پرہول کیفیت کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ دلوں میں محبت اور اخوت کے جذبات کو بیدار کیا جائے۔ اس ضمن میں ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

سرورؔ دکھانا تھا مجھے چہرہ ہر ایک کا۔ آئینہ ہر غزل کو بنانا پڑا مجھے
ہم رسمِ محبت کو نبھاتے ہی رہیں گے۔ دشمن کو گلے سے بھی لگاتے ہی رہیں گے

غلام سرور کی فکری اڑان جاری ہے اور نت نئی بلندیاں سر کرتے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آگے چل کر وہ اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن انھیں ابھی شاعری میں اور بھی مشق کی ضرورت ہے۔ بیشتر جگہ ان کی غزلوں پر نظر رکتی ہے۔ اگر وہ اس جانب توجہ دیں تو یقین ہے کہ ادبی حلقہ خوشدلی سے ان کا استقبال کرے گا۔ ☆☆☆☆

سبطین پرواز
کٹیھار (بہار)
Mob:9472217246

غلام سرور ہاشمی۔ایک ہونہار شاعر

اردو اور ہندی کے ادبی منظر نامہ میں غلام سرورصاحب اپنی شاعری کے حوالے سے ابھر کر سامنے آنے والے نوجوان شاعر ہیں۔ درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔شاعری کے علاوہ مشاعروں کی نظامت بھی بحسن خوبی کرتے ہیں۔ہندوستان کے مختلف خطوں میں اپنے فکروفن کے جوہر دکھا چکے ہیں۔اردو رسائل و جرائد کے علاوہ ہندی کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے کوئی درجن بھر ہندی پرچوں کی نمائندگی انھیں حاصل ہے۔ساتھ ہی اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے مقتدر ادبی رسائل کی مجلس مشاورت کے اہم رکن کی حیثیت سے ان کی توسیعِ اشاعت میں بھرپور تعاون دے رہے ہیں۔اپنے منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے ہندی اور اردو زبانوں کے پروگراموں میں مقبولیت حاصل ہے۔

انھوں نے ۸/جون ۱۹۸۳ء کو ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھیں کھولیں یہ صوبہار کے ضلع گوپال گنج کے بسڈیلہ ٹولہ مرغیاں میں ایک باعزت شریف خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ابتدائی دور سے ہی تعلیم کی طرف رجحان تھا۔اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی جنون کی حد تک کوشاں رہتے تھے اور وہ جنون آج بھی جاری ہے۔اردو انگریزی دونوں زبانوں میں M.A کے سند یافتہ ہیں اور ایک ہائی اسکول میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

غلام سرور ہاشمی صاحب کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا بلکہ موصوف تو موروثی شاعر ہیں ان کے دادا پر دادا طنز و مزاح کے شاعر رہ چکے ہیں۔انھوں نے پہلی غزل ۱۹۹۹ء میں کہی جس کے دو شعر طبع کی ضیافت کے لئے پیش کیے جاتے ہیں۔

خوشی کے واسطے ہر غم چھپائے جاتے ہیں
غموں کا بوجھ بھی خود ہی اُٹھائے جاتے ہیں
بچھایا کرتے تھے پلکیں ہم ان کی راہوں میں
ہمارے دل پہ وہ خنجر چلائے جاتے ہیں

غلام سرور ہاشمی صاحب کو اپنے دادا کی حوصلہ افزائی اور دعائیں ملتی رہیں اور آگے قدم بڑھاتے رہے۔ جناب کوثر سیوانی صاحب سے مشورۂ سخن کرتے تھے پھر ان کے بعد ایس۔ایم نعمانی صاحب سے رہنمائی ملتی رہی۔انھیں اساتذہ کے مفید مشوروں کا فیض ہے کہ ان کا شعری سفر ارتقائی منزلیں طے کرنے لگا ہے۔موصوف مشاعرے کے شاعر ہیں۔ترنم سے جب اپنا کلام پیش کرتے ہیں تو ایک سماں سا بندھ جاتا ہے۔مختلف اصنافِ سخن پر ان کی تخلیقی شادابیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔اب تک غزلیں،نظمیں،نعت،قطعات،برہ گیت،لوک گیت،بھجن جیسی اصناف میں تقریباً سو کے قریب کلام کو اکٹھا کر چکے ہیں۔

مشاعرہ سننے کا شوق بچپن سے رہا ہے اور یہی شوق انھیں شعر گوئی کے زینے تک لے گیا۔آج خود بھی ان مشاعروں کا ایک ناگزیر حصہ بن چکے ہیں اور اپنا کلام سنا کر لوگوں سے داد حاصل کر رہے ہیں۔پھر سینئر ادبی دوستوں اور بزرگوں کے اصرار پر رسائل میں چھپنا شروع کیا۔اب تک بیسوں رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

غلام سرور ہاشمی صاحب،احمد ندیم اور سبطین پروانہ کٹھیاری صاحبان کو اپنا آئیڈیل شاعر اور ادیب تصور کرتے ہیں۔ان کے مشوروں پر عمل کرنا اپنے لئے خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ایک دن وہ اپنی منزل کو پالیں گے اور خوش فکر شاعروں میں ان کا بھی شمار ہونے لگے گا۔بس یہی دعا ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆☆☆

غلام سرور ہاشمی سے ایک ملاقات

ملاقاتی: سبطین پروانہ کٹیہاری

غلام سرور ماشاءاللہ خوب مست مگن ہو کے شعر کہتے ہیں۔ کس کس کی داد دی جائے۔ اکثر بڑی بے باکی سے شعر کہنے والا غلام سرور اپنے بہار کے اسٹیج تک ہی محدود کیوں ہے؟ مبارکباد اُن کے ادبی دوستوں کو دے رہا ہوں کہ ایسے خوبصورت شعر کہنے والے شاعر کو اُردو ادب کے قارئین تک رسائی حاصل کروار ہے ہیں۔ رسائل و جرائد میں کلام شائع کروانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ جناب غلام سرور ہاشمی کی خصوصیات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک خوش فکر شاعر، اچھے استاد اور بے حد سادگی پسند انسان ہیں۔ خوبصورت آواز والے غلام سرور جہاں اپنے ترنم سے دلوں کو موہ لیتے ہیں وہیں اپنی سادگی اور خاکساری سے بھی دوسروں کو جلد اپنا بنا لیتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ وہ پیشے سے سرکاری ٹیچر کے عہدے پر براجمان ہیں۔ لیجئے ادبی محاذ کے قارئین کے لئے اُن سے لیا گیا انٹرویو پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ضرور پسند فرمائیں گے۔ (سبطین پروانہ)

سوال: آپ نے شاعری کب سے شروع کی؟

جواب: شاعری کا شوق تو بچپن ہی سے ہے لیکن باقاعدہ آغاز 1999ء سے کیا۔

سوال: شاعری آپ کا شوق ہے یا پیشہ ہے؟

جواب: شاعری میرا شوق ہے پیشہ نہیں۔

سوال: اگر شاعری نہ کرتے تو کیا کرتے؟

جواب: شاعری سے ہمیں بے پناہ محبت ہے۔ شاعری نہ کروں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

سوال: اسٹیج کی شاعری پسند ہے یا ٹیبل کی؟

جواب: میں ٹیبل اور اسٹیج دونوں طرح کی شاعری پسند کرتا ہوں۔

سوال: کس شاعر سے متاثر ہیں اور کیوں؟

جواب: راحت اندوری سے کافی متاثر ہوں کیونکہ ان کے شعر کہنے کا انداز تو اچھا ہی ہے اس کے ساتھ حالاتِ حاضرہ کی بھرپور عکاسی بھی ہوتی ہے۔

سوال: شاعری سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی اور کب سے آپ کا شعری سفر جاری ہے؟

جواب: شاعری مجھے وراثت میں ملی ہے اس لئے شاعری کا سفر بچپن ہی سے جاری ہے، لیکن بچپن سے لے کر ابھی تک کے اس سفر میں ایک ایسا حادثہ میرے ساتھ ہوا، جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جب میں آٹھویں درجہ میں ناکام ہو گیا تو میرے داداجان نے مجھ سے پوچھا کہ تم رات بھر پڑھتے ہو پھر بھی کیوں ناکام ہو گئے؟ میں خاموش ان کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا۔ مار بھی پڑی۔ رات میں جب میری کاپیاں چیک کی گئیں تو ان میں صرف غزلیں اور کچھ کہانیاں لکھی ملیں۔ دوبارہ ڈانٹ پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں غصے کی حالت میں گھر سے نکل گیا۔ کئی مہینوں تک یوں ہی بھٹکتا رہا۔ پٹنہ، دربھنگہ، مظفر پور، اڑیسہ، دلی، احمد آباد وغیرہ جگہوں میں گھومتے گھماتے جمشید پور پہنچا۔ وہاں میری ملاقات مشہور شاعر راج جمشید پوری سے ہوئی، جو رشتے میں میرے خالو ہیں۔ اب انھیں کے ساتھ رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد وہ مجھے میرے گھر پہنچا گئے۔ مگر آج بھی اُن دنوں کی شاعری پڑھتا ہوں تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل جاتے ہیں۔

سوال: لکھنے کا بہتر وقت کیا ہے؟

جواب: لکھنے کا بہتر وقت میرے لئے سفر ہے، کیونکہ سفر کے دوران مجھے کہنے کی تحریک ملتی ہے۔ میں شعر گنگناتا رہتا ہوں اور میرا سفر آرام سے طے پا جاتا ہے۔ سفر کے دوران مختلف تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور یہی تجربات میری شاعری کا حصہ بن جاتے ہیں۔

سوال: دل سے لکھتے ہیں یا پبلک ڈمانڈ کے مطابق؟

جواب: لکھتا تو دل سے ہوں، لیکن پبلک ڈمانڈ کے مطابق سناتا

ہوں۔

سوال: شاعری میں کوئی مقام پانے کی تمنا ہے؟

جواب: کوئی تمنا نہیں ہے۔ نہ صلے کی تمنا نہ ستائش کی پروا لیکن یہ بھی ہے کہ ۔

میں مر کے بھی ہونا امر چاہتا ہوں
میں اہلِ ادب کی نظر چاہتا ہوں
جو مشہور کر دے مجھے اس جہاں میں
میں اپنے لیے وہ ہنر چاہتا ہوں

سوال: خاندان میں کون کون ہیں اور کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

جواب: میری شادی ہو چکی ہے۔ میرے خاندان میں والد والدہ دونوں حیات ہیں۔ دو بہنیں ایک بھائی ہے۔ ایک بہن کی شادی ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ میں اور میری بیگم دونوں تعلیمی شعبے سے وابستہ ہیں۔

سوال: گھر میں سب سے زیادہ کس کو عزیز رکھتے ہیں؟

جواب: گھر میں سب سے زیادہ عزیز میری ماں ہیں جن کا خیال خاندان کے سبھی افراد رکھتے ہیں۔

سوال: خاندان کے ساتھ کس طرح وقت گزارنا پسند ہے؟

جواب: سبھی افرادِ خانہ سے فکری ہم آہنگی کے ساتھ خوشگوار ماحول میں وقت گزارنا پسند کرتا ہوں۔

سوال: خاندان کے لئے کیا خاص کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: خاندان کے لئے خاص کر دعا کرتا ہوں کہ ہمارا خاندان ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہے۔

سوال: مشاعرے میں کیا بدلاؤ چاہیں گے؟

جواب: اکثر مشاعروں میں ابھرتے ہوئے شاعروں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس روایت کو بدلنا چاہیے۔ نئے شاعروں کو بھی موقع دینا ضروری ہے تا کہ ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔

سوال: آج کل کی سیاست کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: آج کل کی سیاست صالح قدروں سے ہٹ کر گھٹالوں اور گھپلوں کی سیاست بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ مذہب تعصب اور نسلی بھید بھاؤ کو بڑھاوا دیا جانے لگا ہے۔ یہ باتیں ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔ اس بھید بھاؤ کی وجہ سے آج ہمارے ملک سے ایکتا و اتحاد ختم ہو رہا ہے۔

سوال: شاعروں میں کون سی بات بُری لگتی ہے؟

جواب: دوسرے شاعروں کے کلام میں اپنا تخلص لگا کر مشاعرے یا شعری نشست میں کچھ لوگ کلام پیش کرتے ہیں۔ یہ مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔

سوال: پسندیدہ کھانا؟

جواب: سبزی دال ہی میرا پسندیدہ کھانا ہے۔

سوال: پسندیدہ جگہ؟

جواب: اللہ کا گھر۔ مسجد

سوال: پسندیدہ کتاب؟

جواب: قرآن شریف

سوال: پسندیدہ لباس؟

جواب: روایتی پوشاک۔

سوال: دوست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: دوست ایسا ہو جو بُرائیوں سے روکے اور اچھائیوں کی طرف لے جانے کی کوشش کرے۔ سچی دوستی بے لوث محبت کی دلیل ہوتی ہے۔

سوال: شادی کی رسم کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: شادی صرف خواہش نفسانی کو مٹانے کا نام نہیں بلکہ دو روحوں کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ ساتھ ہی یہ ایک مذہبی فریضہ بھی ہے۔

سوال: نئے قلم کاروں کے لئے کوئی پیغام؟

جواب: نئے قلم کاروں کو میں یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اپنے کلام کو اصلاحی رخ دیں اور معاشرے میں پھیلی بُرائیوں کو روکنے کا عہد کریں۔

☆☆☆

غلام سرور ہاشمی کی شعری کائنات

گلے شکوے کو اب دل سے بھلانے کی ضرورت ہے
دلوں میں ایکتا پھر سے جگانے کی ضرورت ہے
رہے ہندو، مسلماں، سکھ عیسائی میں نہ کچھ دوری
محبت کا حسیں گلشن کھلانے کی ضرورت ہے
ہمارے ملک کی تہذیب جو قائم ہے صدیوں سے
اسے ہر حال میں ہم کو بچانے کی ضرورت ہے
کسی کے دل میں نفرت اور حسد باقی نہ رہ جائے
سبھوں کو پیار سے باہم ملانے کی ضرورت ہے
جو ہے خالق ہمارا اور ہے ربِ دوعالم بھی
اسی کے آستاں پر سر جھکانے کی ضرورت ہے
شہیدوں نے لہو دے کر وطن کی آبیاری کی
یہی جذبہ ہر اک دل میں جگانے کی ضرورت ہے

ملا کرتی رہے گی جس کی یہ تنویر مدت تک
''لکھی ہے مصحفِ رخسار کی تفسیر مدت تک''
مرے دل سے تری چاہت کا مٹنا غیر ممکن ہے
رہے گی میری آنکھوں میں تری تصویر مدت تک
کبھی خوشیاں کبھی درد و الم کا ساتھ رہتا ہے
کبھی یکساں نہیں رہتی ہے یہ تقدیر مدت تک
جو غالبؔ کی زمیں میں شاعری کے بیج بوئے گا
رہے گی اس کی غزلوں میں بڑی تاثیر مدت تک
اگر آپس میں یوں لڑتے رہو گے اے وطن والو
غلامی کی رہے گی پاؤں میں زنجیر مدت تک
اگر کردار کو اپنے سنوارو گے تو دنیا میں
ملے گی تم کو بھی سرورؔ یہاں توقیر مدت تک

چین دل کا نیند آنکھوں سے اڑا لے جائے گا
یہ جنوں تو زندگی کا سب مزہ لے جائے گا
جاں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہو جس کے واسطے
چھین کر اک دن تمہارا آسرا لے جائے گا
کس لئے کرتا ہے تو یوں اپنی طاقت پر غرور
وقت کا قزاق تیری ہر ادا لے جائے گا
مال و زر کی یہ ہوس رکھتا ہے اپنے دل میں کیوں
بعد مرنے کے بتا تو ساتھ کیا لے جائے گا
دیکھنے کی دل میں خواہش ہے مجھے اس تاج کی
کون جانے کب مقدر آگرا لے جائے گا
مطلبی دنیا میں رشتے بھی ہیں سارے مطلبی
دل لگا کے ان سے سرورؔ کیا بھلا لے جائے گا

اپنے غموں کو سب سے چھپانا پڑا مجھے
ہونٹوں کو قہقہوں سے سجانا پڑا مجھے
دل کا سکون لوگوں کو دینے کے واسطے
خود چھاؤں بن کے دھوپ میں جانا پڑا مجھے
تاریکیاں جہاں کی مٹانے کا سوچ کر
دل میں چراغِ عزم جلانا پڑا مجھے
سرورؔ دکھانا تھا مجھے چہرہ ہر ایک کا
آئینہ ہر غزل کو بنانا پڑا مجھے

حالِ دل اپنا کبھی ہم جو سنانے نکلے
درد میں ڈوبے ہوئے سارے فسانے نکلے
آپ نفرت کا اگانے لگے جنگل ہر سو
بستیاں پیار کی ہم لوگ بسانے نکلے
راہ میں پھول بچھاتا رہا جن کی ہردم
میرے رستے میں وہی کانٹے بچھانے نکلے
حق کا پرچم لیے ہاتھوں میں وہی آلِ رسول
اپنے ہی خون کے دریا میں نہانے نکلے
ہم روایت کے امیں آج جہاں میں سرورؔ
اپنے اجداد کی دستار بچانے نکلے

دشمنی دل میں بساتے ہیں زمانے والے
خود ہی مٹ جائیں گے اوروں کو مٹانے والے
ہم کو معلوم ہے انجام ہر اک ظالم کا
خود بھی روئیں گے کبھی ہم کو رلانے والے
یوں تو ملتے ہیں زمانے میں بہت دوست مگر
کم ہی ملتے ہیں محبت کو نبھانے والے
وقت مٹھی سے نکل جائے گا بالو کی طرح
ہوش میں آ ذرا یوں وقت گنوانے والے
ایک اک پل کی کرو قدر ہمیشہ سرورؔ
پھر نہ آئیں گے یہ لمحے کبھی جانے والے

غلام سرور ہاشمی کی شعری کائنات

ظلم ڈھاکر ماں کو بھی جس نے پریشاں کردیا
اس نے اپنے واسطے دوزخ کا ساماں کردیا
کفر کی تاریکیاں بڑھنے لگیں دنیا میں جب
نورِ حق سے آپ نے ہرسو چراغاں کردیا
کٹ رہی تھی زندگی رنج و الم کے غار میں
آپ کی چشمِ کرم نے دل کو شاداں کردیا
اک ہدایت کا صحیفہ ہم کو دے کر آ نے
امتِ عاصی کی بخشش کا بھی ساماں کردیا
یہ مرے آقا کی چشمِ فیض کا ہے معجزہ
جس بیاباں پر نظر ڈالی گلستاں کردیا
یہ بھی ہے تسلیم سرور دے کے پیغامِ وفا
آدمی وحشی تھا پہلے اس کو انساں کردیا

راہِ مشکل میں قدم جو ہے بڑھانے والا
اپنی منزل کو یقیناً ہے وہ پانے والا
تم مجھے دل سے بھلادو یہ تمہاری مرضی
میں نہیں تم کو کبھی دل سے بھلانے والا
یوں تو مل جاتے ہیں دنیا میں بہت دوست مگر
کوئی ملتا ہی نہیں ساتھ نبھانے والا
جس کو میں دوست سمجھتا رہا ہردم لیکن
اک وہی مجھ پہ تھا الزام لگانے والا
نارِ دوزخ میں اسے جلنا پڑے گا آخر
اپنے ماں باپ کو جو بھی ہے ستانے والا
وقت کی قدر کرو دل سے ہمیشہ سرور
کیونکہ کہ یہ وقت نہیں لوٹ کے آنے والا

قاتل نہیں ہے کوئی گنہگار نہیں ہے
اس کو سزا ملی جو خطاکار نہیں ہے
ہم کو نگاہِ بد سے بچانا تو اے خدا
حالت ہمارے ملک کی ہموار نہیں ہے
کہنے کو یوں تو لوگ ہیں اپنے بہت یہاں
مشکل میں اپنا کوئی مددگار نہیں ہے
تم جاچکے جو روٹھ کے مجھ سے مرے رفیق
مدت ہوئی تمہارا سماچار نہیں ہے
ماں باپ کے جو دل کو دکھاتا ہے ہرگھڑی
دنیا میں اس سے بڑھ کے تو بدکار نہیں ہے
سرور تمہارے ساتھ ہوں گر ماں کی دعائیں
منزل کو پانا پھر کوئی دشوار نہیں ہے

آپ کے پیار کی سوغات سے جی ڈرتا ہے
مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے
نفرتیں دل میں بڑھادیتے ہیں لوگوں کے یہی
زہر آلودہ خیالات سے جی ڈرتا ہے
جن کی نیت ہے غریبوں پہ ستم ڈھانے کی
دوستو! ان کے خیالات سے جی ڈرتا ہے
چار تنکے ہی مری چھت کے بچے ہیں مولا
اب تو ہلکی سی بھی برسات سے جی ڈرتا ہے
تری باتوں سے جبینیں ہیں شکن آلودہ
مجھ کو اے دوست تری بات سے جی ڈرتا ہے
موت برحق ہے یہی سوچ کے سرور صاحب
عیش میں ڈوبی ہوئی رات سے ڈر لگتا ہے

کٹیا میں مری تھوڑی ضیا تک نہیں آتی
اونچی ہوں فصیلیں تو ہوا تک نہیں آتی
ڈھاتا ہے ستم ہرگھڑی مجبوروں پہ کیوں تو
پتھر ہے ترا دل کہ دیا تک نہیں آتی
ماں باپ کی عزت کا جنھیں پاس نہیں ہے
وہ بے ادب ہیں ان کو حیا تک نہیں آتی
رہتی ہے سدا ماں کی دعا بن کے محافظ
نزدیک مرے کوئی بلا تک نہیں آتی
اے دوستو! شک کو نہ کبھی دل میں بٹھانا
شکّی کو تو ملنے کی ادا تک نہیں آتی
سنسان ہے کیوں گھر میاں سرور یہ تمہارا
گھر سے کسی بچے کی صدا تک نہیں آتی

ٹھوکریں زندگی میں کھاتا ہوں
درد سہتا ہوں غم اٹھاتا ہوں
مشکلوں کے بھنور میں رہ کر بھی
حوصلے اپنے میں بڑھاتا ہوں
جب بھی ملتا ہوں دوستوں سے کبھی
اپنے لب پر ہنسی سجاتا ہوں
اس کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے
دل کو جب آئینہ بناتا ہوں
زندگی کے نحیف کاندھے پر
لاش حسرت کی میں اٹھاتا ہوں
جب بھی کہتا ہوں میں غزل سرور
حالِ دل اپنا میں سناتا ہوں

منتخب اشعار

ہم رسم محبت کو نبھاتے ہی رہیں گے
دشمن کو گلے سے بھی لگاتے ہی رہیں گے
کرتے رہے، جو دشمنی ہر وقت میرے ساتھ
میں ان کی مشکلوں میں مددگار ہو گیا
جو مشہور کردے مجھے اس جہاں میں
میں اپنے لئے وہ ہنر چاہتا ہوں
عجیب بات ہے ہم جن سے پیار کرتے ہیں
ہمارے دل پہ وہ خنجر چلائے جاتے ہیں
دل سے تم آواز دو آجاؤں گا
میں کسی کا دل دکھا سکتا نہیں
اک نظر ہی مجھے دیکھا ہے مگر جانِ جگر
مجھ کو لگتا ہے کہ برسوں سے ہے ناطہ اپنا
کس سے شکوے کروں تم کہو دوستو
خود مجھے زندگی نے رُلایا بہت
یوں ماں کی دعا کرتی ہے سر پر مرے سایہ
نزدیک میرے کوئی بلا تک نہیں آتی
آگ نفرت کی لگا دیتے ہیں دنیا میں یہی
زہر آلودہ خیالات سے جی ڈرتا ہے
شہر میں بہتے لہو کی ندّیوں کو دیکھ کر
دل کھنچا جاتا ہے اپنا آج صحرا کی طرف
عشق میں پھاڑ دیا جیب و گریباں اپنا
وہ نظر آتے ہیں اب پیار میں پاگل کی طرح
بلا کی موج نے گھیرا ہے مجھ کو
مری قسمت میں کیا ساحل نہیں ہے

تمہارے بن مجھے شام و سحر اب
کسی پہلو سکونِ دل نہیں ہے
تمھاری منزلیں قدموں کو چومتیں آکر
تم اپنے حوصلے دل میں اگر جواں رکھتے
قاتل نہیں ہے کوئی گناہگار نہیں ہے
اس کو سزا ملی جو خطا کار نہیں ہے
ہم کو نگاہِ بد سے بچانا تو اے خدا
حالت ہمارے ملک کی ہموار نہیں ہے
کہنے کو یوں تو لوگ ہیں اپنے بہت یہاں
مشکل میں کوئی اپنا مددگار نہیں ہے
تم جا چکے جو روٹھ کے مجھ سے مرے رفیق
مدت ہوئی تمہارا سا چار نہیں ہے
ان اندھیروں میں نظر آتی ہیں کرنیں کیسی
کس کے جلوؤں کی جھلک ہے یہ اجالا کیا ہے
سرور تمھارے ساتھ ہوں گر ماں کی دعائیں
منزل کو پانا پھر کوئی دشوار نہیں ہے

☆

جب بھی ملتا ہوں دوستوں سے کبھی
اپنے لب پہ ہنسی سجاتا ہوں
اس کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے
دل کو جب آئینہ بناتا ہوں

☆

کچھ بھی نہ ساتھ جائے گا اعمال کے سوا
تم اپنی خواہشوں کی وہ چادر سمیٹ لو

☆☆☆

Unfiled Notes Page 30

غلام سرور ہاشمی کے ادبی وثقافتی شب وروز

یومِ آزادی کے موقع پر ایم۔ جی۔ ایم اسکول میں کلام پیش کرتے ہوئے

تقریری مقابلے میں اول آنے پر طانیہ آفرین کو داروغہ شری بی۔ این۔ پاسوان نوازتے ہوئے

کون بنے گاویز مقابلے میں طلبہ سے خطاب کرتے ہویے

غلام سرور ہاشمی کو شیروانی پہناتے ہوئے ان کے والدِ محترم جناب صابر حسین

سن رائز اکاڈمی کی جانب سے شال پوشی

ایک مشاعرے میں دائیں سے چوتھے نمبر پر

غلام سرور ہاشمی کے ادبی و ثقافتی شب و روز

علم کی اہمیت پر تقریر کرتے ہوئے

یومِ اساتذہ کے موقع پر طالبات کے ساتھ کیک کاٹتے ہوئے

ٹیلینٹ سرچ مقابلے میں اول مقام پانے والے ساجد مہتاب کو تمغہ پیش کرتے ہوئے

یومِ اساتذہ کے ایک مشاعرے میں غلام سرور ہاشمی کی پذیرائی

Unfiled Notes Page 32

ڈاکٹر محفوظ الحسن (گیا)

ترانہ جاوید۔ایک تاثراتی مطالعہ

عبدالمتین جامی اڑیسہ کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔مجھے یاد آرہا ہے کہ غالباً بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ان سے ان کے صوبے میں دید وشنید ہوئی تھی۔کچھ سالوں تک خط وکتابت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ان ہی دنوں ایک شعری مجموعہ "نشاط آگہی" پر میرا تبصرہ شائع ہوا تھا۔اس کے بعد عبدالمتین جامی سے رسالوں میں ضرور ملتا رہا لیکن ان کی کوئی کتاب مجھے نہیں ملی۔چند دنوں قبل ڈاک سے ایک کتاب ملی "ترانۂ جاوید"۔نام درج تھا عبدالمتین جامی بھیجنے والے کا۔جو خود مصنف/ خالق/شاعر ہیں۔ایک مدت کے بعد نے میں انھیں فون کیا اور شکریہ ادا کیا۔

"ترانۂ جاوید" رباعیوں کا دیوان ہے۔اردو میں پہلی کوشش نہیں ہے۔صرف اور صرف رباعیوں کے مجموعے تو مختلف شعرا کے منظر عام پر آتے رہے ہیں مگر رباعی کا دیوان ناوک حمزہ پوری کا بھی ہے جسے میں نے نہ دیکھا ہے اور نہ پڑھا ہے۔اس کے پہلے بھی رباعیوں کے دو مجموعے جامؔی کے شائع ہو چکے ہیں جو میری نظر سے نہیں گزرے ہیں۔مجھے نہیں معلوم ان دونوں مجموعوں میں شامل رباعیاں بھی اس میں ہیں یا بالکل الگ ہے اور اس میں شامل رباعیاں صرف اسی میں ہیں دوسری جگہ نہیں۔

رباعیوں پر کچھ گفتگو کی جائے اس کے پہلے عبدالمتین جامؔی کے بارے میں کرامت علی کرامتؔ کی رائے نقل کرنا ضروری ہے تا کہ جامؔی کی فن کاری کے میدان کا صحیح صحیح علم ہو سکے۔

پروفیسر کرامت علی کرامت امجد نجمی کے بعد آج کے اڑیسہ کے بابائے اردو ہیں، صحافی ہیں، شاعر ہیں، منفرد فکر کے ناقد ہیں۔جامؔی کے مجموعہ رباعیات "بساط سخن"، اور "مونس سخن" کی روشنی میں انھوں نے جامؔی کی جو ادبی تصویر بنائی ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہیں۔

"عبدالمتین جامی عجیب وغریب مخلوق ہیں، شاعری، تنقید، افسانہ، ناول، ڈرامہ، منظوم تمثیل، خاکہ، انشائیہ، جاسوسی ناول، اڑیا اور بنگلہ کے ادب عالیہ کا ترجمہ غرض کہ ادب کا کون سا قابل ذکر شعبہ ہے جو ان کی تخلیقی اور فنی دسترس سے باہر ہے۔صرف شاعری ہی کا میدان لیجیے تو آپ کو دیکھ کر یقیناً تعجب ہوگا کہ غزل پابند نظم، آزاد نثری نظم، غزل نما، ترائیلے، سانیٹ، دوہا، دوہا غزل، رباعی گویا ہر اہم صنف سخن میں انھوں نے اپنے اشہبِ قلم کو مہمیز کیا ہے۔عبدالمتین جامؔی کو بلاشبہ ایک ہمہ جہت (versatile) شخصیت کا مالک قرار دیا جا سکتا ہے"۔(ترانہ جاوید صفحہ ۷)۔

اس سے پہلے کہ میں جامی کی رباعیات کی موضوعات کی پیش کش اور مظامین کے برتنے کے فن پر کوئی گفتگو کروں رباعی کے بارے میں چند باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں نیز ماہر عروضیوں سے گزارش ہے کہ میرے ان مصروفیات کا تشفی بخش جواب دیں۔میں نے بہت پہلے ابراہیم اشک کی رباعیوں پر گفتگو کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا وہ یہاں نقل کر رہا ہوں۔

"رباعی" عربی لفظ ہے اس کا مادہ ر،ب،ع ہے۔ربع کے معنی چوتھائی کے ہوتا ہے۔ادبی اصطلاح میں رباعی شاعری کی ایک صنف ہے ایسی صنف جو چار مصرعوں پر مشتمل ہو۔اس شرط کے ساتھ کہ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ وہم ردیف ہو، چاروں مصرعوں کے اوزان اور بحر ایک ہو"۔

بحر و وزن کی بات آگئی ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ عروض دانوں نے اس صنف کے لئے بحر مخصوص کردی ہے اور وزن بھی (یعنی رباعی کے لیے بحر ہزج کی ۲۴ رزحافات مخصوص ہیں۔بعضوں نے اس کی تعداد سینکڑوں بتائی ہے)۔میں عروض سے اتنا واقف نہیں مگر جو تھوڑی بہت نصابی شد بد حاصل ہے اس کی بنا پر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ عروضیوں کی اس زیادتی نے اس صنف میں شاعروں کے لئے تجربات کے دروازے بند کر دیے ہیں۔اس طرح ان کی اختراعی قوت پر قدغن لگا دی گئی ہے۔اگر کسی عالی ظرف فن کار اور عظیم شاعر نے اس حد بندی کو نا منظور کرتے ہوئے بحر و وزن کی پابندی سے انحراف کرتے ہوئے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے تو اسے صنف رباعی ماننے سے انکار کر دیا گیا ہے۔واضح ہو کہ رباعی کے لئے ہزج کی سالم بحروں کے استعمال کی بھی اجازت عروضیوں نے نہیں دی ہے۔جب شاعری کی دوسری اصناف مثلاً قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کے لئے کسی مخصوص بحر و وزن کی قید نہیں تو پھر رباعی کا شاعر اس قید و بند کی صعوبت کیوں برداشت کرے؟اس آزادی کے زمانے میں جب غزل آزاد ہوگی، نظم آزاد ہوگی حتیٰ کہ نثر آزاد ہوگی، رباعی کا شاعر لکیر کا فقیر ہی بنا رہے؟(ماخوذ از مطالعہ ص ۲۴)۔

رباعی کے تعلق سے شہاب جعفری کی رباعی پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

"رباعی اپنے مخصوص اوزان کی وجہ سے بے حد دشوار صنف کہی جاتی ہے۔گو ہر عہد میں اس پر طبع آزمائی ہوتی رہی ہے مگر اس صنف میں کمال حصول بے حد دشوار رہا ہے۔اس صنف میں کامیابی اسے ہی حاصل ہوتی ہے جس کو قدرت نے شاعرانہ وجدان سے نوازا ہوتا ہے اور جس کے اندر حکیمانہ بصیرت ہوتی

ہے، جس کا مطالعہ گہرا اور ہمہ گیر ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ تیز اور جس کا ادارک وشعور پختہ اور تجربات کی دنیا متنوع ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اسے فنی باریکیوں پر عبور ہوتا ہے۔(ماخوذ از مطالعہ ص۲۲)

رباعی اور جامؔی کی رباعی کے مضامین، موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے کرامت علی کرامت نے لکھا ہے۔

''اس میں کلام نرم و ونازک کی بھی گنجائش ہے اور تلخ واردات کی حقیقت بیانی بھی۔عبدالمتین جامؔی کی رباعیوں میں مذکورہ دونوں قسم کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ان کے یہاں کہیں اخلاقیات، امن پسندی، بشر دوستی' کے پیغام سے لبریز رباعیاں نظر آتی ہیں تو کہیں فلسفۂ حیات، اور تصوف کی عکاسی کرتی ہوئی اور کہیں طنز کے نشتر چبھوتی ہوئی یا پھر خالص غزل کی طرح واردات قلبی کا جام چھلکاتی ہوئی رباعیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''(ترانہ جاوید ص۹۔۸)

ان موضوعات کے تحت پیش کردہ مثالوں کی طور پر جن رباعیوں کو نقل کیا گیا وہ 'ترانہ جاوید میں شامل نہیں۔ممکن ہے 'بساط سخن' اور 'مونس سخن' میں ہوں۔قمر سنبھلی مونس سخن کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''عبدالمتین کے یہاں موضوعات کی بہتات ہے۔نئی نئی ردیفوں اور مشکل قوافی میں جس روانی کے ساتھ وہ رباعی کے تخلیقی عمل سے گزر رہے ہیں حیرت ہوتی ہے۔حمد ونعت اور دیگر مذہبی موضوعات کے ساتھ تہذیبی، اخلاقی، معاشی، سماجی، وطنی، معاشرتی، حسن وعشق، ہجر ووصال، انسانی قدریں، ادائی امتیازات اور جدید عصری تقاضوں کی حامل رباعیات غور وفکر کا مطالبہ کرتی ہیں''۔(ترانہ جاوید ص۱۳)

یہ باتیں موصوف نے 'مونس سخن' کے حوالے سے لکھی ہیں۔اور مثال بھی مونس سخن کی رباعیوں کے ہی پیش کی گئی ہے۔شارق عدیل نے جامی کو''رباعی کا مزاج داں شاعر کہا ہے ان کی رباعیوں اور تیرائلے کی جو مثال دی ہے وہ بھی اس دیوان کی زینت بنی ہیں۔ان کے دیوان میں شامل کیے گئے تینوں مضامین اہم ہیں اور جامی کی رباعی گوئی اوران کی فن کارانہ مہارت کی شہادت ضرور ہیں مگر مجھے اس کتاب میں ان کی شمولیت کا جواز سمجھ میں نہیں آیا۔

اس دیوان میں شامل رباعیوں کے تعلق سے اگر کچھ گفتگو ہوتی تو اس کا جواز تھا مگر میں ذاتی طور پر اس کا بھی حامی نہیں ہوں۔اس قسم کی تحریروں کی شمولیت کا قاری فن کار کے بارے میں آزادانہ رائے قائم نہیں کر سکتا۔اور اس کی اپنی ذاتی رائے تحفظات کا شکار ہو جاتی ہے۔جامؔی جیسے فن کار کو تو کسی بناؤ سنگار یا سفارش کی ضرورت ہی نہیں تھی۔بہر کیف ان کے ''ترانہ آزاد'' پر کچھ باتیں کر لی جائیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ ''بساط سخن'' کی رباعیوں کی تعداد کتنی ہے۔مونس سخن کے بارے میں قمر سنبھلی کی اطلاع ہے کہ ۴۶۵/اس میں شامل ہیں۔یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ان ہی بساط سخن کی بھی رباعیاں ہیں یا یہ بالکل الگ رباعیاں ہیں۔

رباعیوں کے دیوان 'ترانہ جاوید' میں شامل رباعیوں کی تعداد ۳۳۷/ اور اگر ان کی آزاد رباعی کے اختراعی تجربے کو بھی شامل کر لیا جائے تو رباعیوں کی مجموعی تعداد ۳۴۵/ہوتی ہے۔یہ آزاد رباعیاں مونس سخن میں شامل ہیں، یہ اطلاع خود جامی کی ہے۔

زود گوئی، قدرت کلامی پر دال ہوتی ہے مگر معیار کی ضمانت بھی ہوتی ہے یہ دعویٰ کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے، مگر عبدالمتین جامی کی کثرت رباعی گوئی پر فنی لحاظ سے کسی نے گرفت نہیں کی ہے اور نہ ہی ان کے معیار فن پر حرف گیری، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ جن رباعی گو شاعروں کو درجہ استناد حاصل ہے ان میں عبد المتین جامی بھی ہیں، کثرت کے ساتھ فنی معیار پر بھی قابو پانا حیرت انگیز ضرور ہے اور جامی کی رباعیاں بقول ماہرین فن اس حیرت انگیزی کی خوبصورت مثال ہیں۔ دیوان میں جو رباعیاں شامل ہیں ان میں مجھے حسن وعشق کی رعنائیاں، شراب وشباب کی انگڑائیاں، ہجر ووصال کی کربنا کی وطرب نا کی کا براہ راست بیانیہ انداز واظہار نظر نہیں آتا۔اشاروں اشاروں میں کسی کی کوئی جھلک ملتی بھی ہے تو کوئی جادوئی اثر نہیں دکھاتی ہے۔کبھی کبھی یہ بھی احساس بار بار ہوا کہ ان میں آمد کم اور آورد زیادہ ہے۔اور ایک دیوان مرتب کرنے میں ایسا ہونا لازمی ہے۔آج کے تناظر (ملکی، ملی، و بین الملی، دوامی) میں اگر ان رباعیوں کا مطالعہ کیا جائے تو عہد حاضر کا منظر نامہ، دادا گیری، دہشت زدگی، اخلاق و اقدار کی زوال آمادگی، خارجی سماج کی بخشی ہوئی آلائشیں، نسوانی آزادی کی مغربی تشہیر اور گھر کی زینت کا بازار کی جنس بننے کا منظر نامہ یعنی سیاست، معاشرت، تہذیب وثقافت کی بدلتی تصویر ہی ان رباعیوں میں دیگر موضوعات کے ساتھ بڑی خوبی، خوبصورتی، زبان کی صفائی، سادگی اور شگفتگی کے ساتھ نظر آتی ہے، جن کے اثرات سے ہم آج دامن بچانا بھی چاہیں تو نہیں بچا سکتے کہ کسی نہ کسی شکل میں یہ جراثیم ہماری تہذیب وثقافت، معاشرت ومعیشت میں گھس پیٹھ کر چکی ہیں اور فی الوقت ان کے تدارک کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ مسلمانوں کے مسائل سے گھری زندگی اندرون وبیرون ملک دہشت ووحشت کے لیبل کے ساتھ بھی ان رباعیوں کو فن کارانہ انداز میں پیش کی گئی ہیں۔انتخاب الفاظ میں خوش سلیقگی اوران کی پیش کش میں ہمدردی کی زیریں لہر میں حالات کی بہتری کی امید سے دانستہ نظر مثبت انداز فکر ان رباعیوں میں ورق ورق میں بکھرا ملے گا۔ مختلف مضامین اور موضوعات کی حامل چند رباعیاں پیش ہیں۔مگر پہلے دو حمد ونعت:

اللہ ہے کا مہر تخیل سمجھا تخلیق کا ہے کیسا تسلسل سمجھا
باغی ترے بندے ہیں تو ان پہ کریم کیا تیرا ہے انداز تحمل سمجھا

☆

میں بھول کے سب سود وزیاں آپہنچا۔ واللہ بتا میں یہ کہاں آ پہنچا
یہ شہر مدینہ کی گلیاں جامی۔اک نور کا دریا ہے جہاں آ پہنچا

(بقیہ صفحہ 42 پر)

پروفیسر (ڈاکٹر) عشرت آرا سلطانہ
محلّہ دائرہ، بہار شریف، نالندہ۔ 803101 (بہار)

مایوسی اور امکانات کا آئینہ دار "کھردرے ہاتھ"

اس وقت اس ناچیز کے پیش نگاہ معروف افسانہ نگار شہاب دائروی کا افسانہ "کھردرے ہاتھ" ہے۔ شہاب دائروی کم وبیش نصف صدی سے افسانہ نگاری کے ذریعہ اپنے افکار وخیالات اور اپنے جذبات واحساسات کا اظہار مسلسل ومتواتر فرما رہے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ آپ محتاج تعارف نہیں ہیں کیونکہ آپ کے چار افسانوی مجموعے منصہ شہود پر آچکے ہیں۔ خدا بھلا کرے آپ کا کہ اس اردو شعروادب کی پستی اور اس سے غیر اعتنائی کے دور میں بھی آپ اپنے اردو دوستی اور فن افسانہ نگاری سے قلبی لگاؤ کے اظہار کے طور پر اپنے قلم کو متحرک وفعال رکھے ہوئے ہیں۔ تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ اس وقت آپ کی عمر اڑسٹھ (۶۸ر) سال سے کچھ متجاوز ہی ہوگی۔ اس کبرسنی میں آپ کے افکار وخیالات اور بنت کاری اپنے پورے شباب پر ہے۔ یہ وہ عمر ہے جس عمر میں ایک فن کار تھک ہار کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی کشت ذہن کی پیداواری صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے۔ اور اس کے فکر وشعور پر خامشی کے گھنے اور سیاہ بادل منڈلاتے رہتے ہیں جو تخلیقی چراغوں کے شعاعوں کے لئے سد راہ کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ جب اہل قلم کا تخلیقی جذبہ اور تخلیقی پرواز جاری رہتی ہے تو وہ اپنے تخلیقی عمل کو ہر حال میں جاری وساری رکھتا ہے۔ خواہ اس کی راہوں پر جس قدر آندھیاں، طوفان، زلزلے رونما ہوں۔ زندہ دل اور پُرعزم وحوصلہ مند اہل قلم کی راہ میں نہ کہ سستی مانع ہوتی ہے اور نہ دیگر مصائب و دشواریاں۔ جو شخص مصمم ارادے کے تحت تخلیقی میدان عمل میں اُتر جاتا ہے۔ وہ اپنی منزل مسخر کئے بغیر دم نہیں لیتا۔ اور اس کی منزل محض کچھ شہرت اور نام ونمود کی حصولیابی تک محدود نہیں ہوتی ہے...... بلکہ اس کی منزل اپنے آخری دم تک تخلیقی عمل کو جاری رکھنا ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی فن کار اپنے تخلیقی عمل سے نہ کبھی آسودہ ہوتا ہے اور نہ ہی مطمئن۔ ایک تشنگی، ایک کسک اور مزید کچھ معاشرے کو عطا کرنے کا جذبہ اس کے سینے میں ہمہ اوقات جاگزیں رہتا ہے۔ اور وہ اپنی کاوشوں میں سرگرداں دنیا و مافیہا سے لاتعلق اپنے تخلیقی سفر پر گامزن رہتا ہے۔ چنانچہ شہاب دائروی اگر اس کبرسنی کے باوجود اپنا تخلیقی عمل جاری رکھتے ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ہاں اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ آپ اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی بڑے ہی ایماندارانہ اور مجاہدانہ طور پر فرما رہے ہیں۔ لیکن اسے کیا کہئے کہ آج کا زمانہ کسی کے پُرخلوس کارہائے نمایاں کا انعام تو درکنار داد بھی دینا فراموش کر گیا۔ ایسے ہی کتنے اہل قلم ہیں جن کے بے انتہا احسانات اردو شعروادب اور اہل اردو پر ہیں انھیں سرے سے فراموش کر دیا گیا۔ ان کی لامتناہی کاوشوں کا صلہ ان سے اغماز اور بے اعتنائی کی شکل میں ادا کیا گیا۔ کچھ تو اپنی اس ناقدری کے باوجود متبسم انداز میں اس دار فانی سے رخصت ہوگئے اور کچھ اشک ریزی کے باہم زاد سفر باندھے رخصت ہونے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی مخلص اہلِ قلم میں ایک نام شہاب دائروی کا بھی ہے جو شہرت ودولت کی حرص وہوس سے دور اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہیں۔

یوں تو آپ کے ادبی سفرنامے اور آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد قلمکاروں نے خامہ فرسائی کی زحمت گوارا کی ہیں۔ مثلاً پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر احمد سجاد، پروفیسر ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن، منظر کلیم، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر کاظم، سید معلوم عزیز کاظمی، ظہیر صدیقی، عطا عابدی، پروفیسر ضیاء صابری، افتخار عظیم چاند، ڈاکٹر ابوبکر جیلانی، محمد سلیم ہاشمی، نوشاد معین، بے نام گیلانی، ڈاکٹر سید مرتضیٰ، بانو گیلانی وغیرہم۔ پھر بھی اس ناچیز کو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جتنا کام آپ کی شخصیت اور آپ کی فن کارانہ صلاحیت نیز آپ کی نگارشات کے حسن وقبح کے متعلق عمل پذیر ہونا تھا وہ ابھی تشنہ ہے۔ میرے خیال میں موصوف کی شخصیت اور نگارشات کے کئی پہلو ابھی متقاضی تحقیق وتجسس ہیں۔

ادھر کچھ سالوں سے موصوف کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی مضامین باصرہ نواز ہوئے۔ چونکہ ابھی آپ کا تخلیقی سفر جاری ہے چنانچہ قوی امید ہے کہ آپ پر مزید کام عمل پذیر ہوگا اور آپ کو وہ مقام ومرتبہ ضرور حاصل ہوگا جس کے آپ واقعی مستحق ہیں۔

اس ناچیز کی خامہ فرسائی کا مقصد محض شہاب دائروی کی تعریف وتوصیف بیان کرنا نہیں کہ یہ ناچیز آپ کے افسانہ "کھردرے ہاتھ" کا تجزیہ کرنے سے قبل مذکورہ افسانہ کے افسانہ نگار کا مختصر تعارف بیان کرنا تھا۔ کیونکہ فن کار کی شخصیت سے فن کار کے فن پارے کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کسی نوآموز فن کار اور کہنہ مشق فن کار کی نگارشات کا تجزیہ یکساں طور پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کہنہ مشق فن کار کے افکار وخیالات پختہ و بالیدہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی فن کارانہ مشاقی اس کی نگارشات کی معنویت و افادیت کی ضامن ہوتی ہے۔ دوسری جانب نومشق فن کار اپنے تجربات کے مرحلے میں ہوتا ہے۔ جس کی نگارشات کا معنوی پہلو کمزور اور افادی پہلو غیر مستحکم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر ایک فن کار کے تجربات ومشاہدات کا طویل سلسلہ اس کی نگارشات کی قدر وقیمت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ اسی خیال کے تحت راقم الحروف نے شہاب دائروی کا مختصر تعارف پیش کیا۔ کیونکہ کہنہ مشق فن کار کی فنی چابک دستی نسل نو کے لئے مشعل راہ کا کام انجام دیتی ہے۔

افسانہ ''کھر درے ہاتھ'' کا عنوان ہی افسانوی نظر آتا ہے۔ ہاتھوں کا کھر دراپن ایک انسان کی بے بسی مجبوری اور مختلف مسائل ومصائب کا مظہر ہوتا ہے ۔قدرت نے تمام انسانوں کی جو تجسیم کی ہے وہ یکساں طور پر ہے۔ لیکن وقت اور حالات کے ظالمانہ رویّے کے باعث ہتھیلیوں پر کھر درے پن اور مقدر میں کھوکھلا پن از خود نمایاں ہو جاتا ہے۔ جس کا علاج بھی وقت کے مرہم ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ یہ کھر دراپن قدرت کے انعامات کی نشانی نہیں بلکہ امتحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شہاب دائروی نے اس کھر درے پن کو اپنے افسانے میں مرکزیت عطا کر کے اپنی فکری جولانیوں اور فنی چابکدستی کا بڑے ہی احسن طریقے سے مظاہرہ کیا ہے۔

کسی بھی افسانہ کی تخلیق میں سب سے اولین مرحلہ پلاٹ کا ہوتا ہے ۔ پلاٹ یعنی کہانی کا پلاٹ جس قدر پُرکشش اور پُراثر ہوگا افسانہ اسی قدر افادی اور پُر معنی ہوگا۔ شہاب دائروی کی صفت یہ ہے کہ آپ پلاٹ کے انتخاب میں بڑی ذہن کوبی اور تدبر سے کام لیتے ہیں۔ پلاٹ کے انتخاب میں اس امر کو ملحوظ رکھنا غایت درجہ ضروری ہے کہ یہ سیدھا سادا ہو۔ اس میں ابہام والجھاؤ کی کوئی گنجائش نہ ہوتا کہ قاری کی فہم اسے درست طور پر بہ آسانی انگیز کر سکے۔ مذکورہ افسانہ کا پلاٹ بالکل سادہ اور سپاٹ ہے۔ نہ کہیں ابہام ہے اور نہ جھول....قاری بغیر مشقت کے اس کی معنوی گہرائی میں اُتر سکتا ہے۔ اور افسانہ نگار یا افسانہ کی تخلیق کے اغراض ومقاصد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ افسانہ نگاری میں یہ وہ وصف ہے جس کے بغیر کوئی بھی افسانہ نگار مقبولیت اور شہرت کا زینہ طے نہیں کر سکتا....موصوف کا یہ پلاٹ واقعی قابل داد ہے۔

''اٹھارہ سال پہلے برفیلی ہوائیں ترائیوں سے گزرتے ہوئے نشیبی علاقے میں جب کہراہی کہرا پھیلائے ہوئے تھیں تو نصف ڈھلی کپکپاتی ہوئی رات میں کٹیہار اسٹیشن کے تین نمبر پلیٹ فارم کے کنارے کمبل کے ٹکڑے میں لپٹا ہوا ایک نوازئیدہ بچہ اپنی قسمت کی تاریکی اور انسان کی انتہائی ذلّت پر چیخ رہا تھا.......''

''کیا وہ بچّہ تم ہو.....؟''

''ہاں.....!وہ میں ہوں جس پر ماں کی ممتا کی بارش کبھی نہیں ہوئی۔ باپ کی شفقت سے ہمیشہ بے خبر رہا۔ یتیم خانے کے نگراں رحمت بخش پولیس کی کاروائی کے بعد مجھے اُٹھا لائے تھے' کم عمری جس طرح گزری کہہ نہیں سکتا' ذہن میں جب سوچ کی روشنی پھوٹی تو قوم کی روٹیوں پر پلنے والا یتیم تھا۔ جو کلاس میں سر کھپانے کے بعد نگراں کے گھر کے کاموں میں بیل کی طرح جتا رہتا ہے۔ ایک بار یہ ہوا کہ پانی لے جانے میں سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہاتھوں کی رگوں میں تناؤ سے جب درد ہوا اور بوجھ ناقابلِ برداشت ہو گیا تو بالٹیاں میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑیں اور جگہ جگہ سے پیچک گئیں' مجھ سے جُرم ہوا تھا' سزا ملی اور میرے ہاتھوں پر کئی نشان پڑ گئے۔ پھر بات بات پر نشان پڑتے گئے۔ کبھی نگراں کے لڑکوں سے برابر کی بات کرنے پر' کبھی ان کی طرح کھیلنے کی ضد کرنے پر....'' (کتاب ''شہتوت''۔ صفحہ۔۱۵۶۔۱۵۵)

فن افسانہ نگاری کا دوسرا مرحلہ کردار نگاری کا ہوتا ہے۔ پلاٹ کی کامیابی کردار کے انتخاب پر منحصر ہے......شہاب دائروی کے افسانہ میں کردار نگاری بڑی ہی سوجھ بوجھ کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس میں محض دو مرکزی کردار ہیں۔ کسی افسانے میں کردار کا عددی اختصار اسے بہت سارے نقائص سے محفوظ رکھنے میں معاون ہوتا ہے اور پلاٹ کو صحیح سمت لے جانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

ایک وقت اور نصیبوں کا مارا نعمان ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا فرد ہے جو ظالم زمانے میں کسی کے گناہوں کا خمیازہ بھگت رہا ہے....اور نا کردہ گناہوں کی سزا.....جس کے والدین نے ایک ٹھٹھری ہوئی سرد رات میں ریلوے پلیٹ فارم پر لاوارث چھوڑ دیا تھا۔ یہ اس معاشرے کی وہ کریہہ تصویر ہے جس کے باعث کتنی معصوم زندگیاں پروان چڑھنے سے قبل دم توڑ دیتی ہیں.....یقیناً ایسا اسی وقت در پیش آتا ہے جب وہ کسی جوڑے کی ناجائز اولاد ہو۔ آج اس معاشرے میں جو پیش آرہا ہے خصوصاً اسکول کالج کے طلبا و طالبات کے ناجائز تعلقات یا پھر محلّے کے نوجوان کی جنسیاتی خواہشات کی تکمیل یا کم مائیگی کے شکار خاندانوں کی جواں سال دوشیزاؤں کا حشر یا پھر معاشرے کی تکمیل کا مسئلہ ایسے ناتحمل واقعات کے پس منظر میں وہی سب معاملات ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کے لئے کس قدر مضرت رساں ہوتے ہیں اس کی جیتی جاگتی تصویر نعمان کی زندگی ہے اور اس زندگی کے طور پر ''کھر درے ہاتھ'' کو استعمال کیا ہے۔ اس کے ایک ایک نشان پر کتنی ہی کہانیاں رقم ہو سکتی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے قاری کو تدبیر کی راہ اختیار کرنی ہوتی ہے....گو کہ یہ افسانہ علامتی نہیں ہے.....پھر بھی جو ''کھر درے ہاتھ'' کا وجود ہے وہ ایک علامت ہی کے طور پر ہے جسے اہل بصیرت بخوبی سمجھ سکتے ہیں .....یہ تو ہمارے معاشرے کی محض ایک تصویر ہے۔ دوسری تصویر کا ترجمان اس افسانہ کا دوسرا کلیدی نسوانی کردار ریشما ہے۔ دولت وثروت میں پرورش و پرداخت پائی ریشماں ان گمراہ دوشیزاؤں سے مختلف ہے جن کے قدم کثرت مال وزر کے باعث عیش وطرب کی طلب میں اکثر ڈگمگا جاتے ہیں اور کئی دوشیزائیں تو دانستہ اپنی جنسیاتی تشنگی کی سیری کے لئے از خود گمراہی و تاریکی کی دلدل میں اُترتی جاتی ہیں۔ اور پھر وہاں سے نکلنا دشوار تو ہوتا ہے' کبھی کبھی ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ در پیش ہوتا ہے جس کا شاخسانہ نعمان جیسے انسان کا وجود اور اس کے ہاتھوں کا کھر دراپن ہے۔

مذکورہ افسانہ کا دوسرا کلیدی کردار گو کہ ناز ونعمت میں پرورش و پرداخت پائی ہوئی اس جدید دور کی نیک بخت سلجھی ہوئی اور دل میں انسانی ہمدردی رکھنے والی جوان سال دوشیزہ ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی وہ حسین تصویر ہے جس کی ضوفشانی سے معاشرے کے منور ہونے کے امکانات جاگزیں ہوتے ہیں۔ گو کہ اس کالج میں دیگر نسوانی کردار بھی ہیں جن کے لئے افسانہ نگار نے محض اشاروں سے کام لیا ہے۔ وہ جدید دور کے رنگوں میں کچھ اس طرح رنگی ہیں کہ ان رنگوں سے ان کا رنگ پراگندہ ہی نہیں بلکہ تعفن آمیز ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس ماحول میں رہنے والی ریشماں ان سے مختلف ہے۔ نہ حسن و جوانی پہ ناز' نہ عشوہ و ادا اور نہ اپنی شخصیت پر افتخار نہ تکبر اور نہ جاہ وجلال بلکہ ایک سیدھی سادی لڑکی جو اپنے مقصد اولین یعنی حصول تعلیم میں ہمہ اوقات منہمک لیکن نگاہوں کے دریچے وا رکھنے

Unfiled Notes Page 36

والی اپنے ماحول اور فضا پر عقابی نگاہ رکھنے والی اور اپنے دل میں انسانی ہمدردی کو محفوظ رکھنے والی دوشیزہ ہے۔ جسے جدید دور کی ہوس پرستی اور بے راہ روی نے لمس تک نہیں کیا ہے۔ بلاشبہ وہ بھی ابھی جواں سال ہے اس کے بھی جذبات وارمان ہیں۔ اس کا بھی دل دھڑکتا ہے اس کی سانسیں بھی گرم ہوتی ہیں۔ لیکن اس نے اپنے اخلاق و کردار کے قدم کو بڑے ہی استحکام واستقلال سے مثبت زمین پر جمائے رکھا۔ اس کے لبوں پر تبسم نے اٹھکیلیاں کیں، جذبات بھی جواں ہوئے اس کی نگاہوں میں بھی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن کس کے لئے، ایک وقت کے مارے غریب و مفلس نوجوان کے لئے جس کا ماضی انتہائی کربناک واذیت ناک گزرا اور حال بھی جہدِ مسلسل کا غماز ہے۔ یہ وہ نوجوان ہے جو مصیبتوں، محرومیوں اور فاقہ مستی کی بھٹی میں تپ کر کندن کی طرح اپنے معاشرے میں ضوفشاں رہا اور اس ضوفشاں کردار کی ضوفشانی سے متاثر ناز ونعم میں پلا نسوانی کردار ریشماں ہے۔ یہ دونوں ہی کردار معاشرے کی حقیقی تصویر ہیں۔ معاشرے میں ایسے کردار موجود ہیں جو اس کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہیں۔ مصیبتوں کے انبار میں بھی حصولِ منزل کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو کسی کی مجبوریوں اور محرومیوں سے مغموم ہوتے ہیں۔ اور ان مجبور اور مایوس انسان کی امداد کرنا اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ جس انسان کے اندر جینے کی خواہش ختم ہو جاتی ہے اس کے اندر جینے کی خواہش بیدار کرتے ہیں۔ یہاں شہاب دائروی نے نہ صرف اختصار سے کام لیا ہے بلکہ تعجیل کو راہ دی ہے۔ ریشماں جب نعمان کی رودادِ غم سُن رہی ہوتی ہے تو خاموشی مقتضائے وقت تھی۔ لیکن نعمان کے قصہ ختم کرنے کے بعد ریشماں کا محض تبسم بکھیر کر کسی دکان میں داخل ہو جانا مخلِ نظر لگتا۔ وہاں نہ کوئی ہمدردی کے کچھ الفاظ اور نہ صبر وسکون وجدوجہد کی تلقین، یہ عمل خلاف توقع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہاب دائروی نے اختصار کے لئے دل کی تڑپ پر قدغن لگا دیا۔ بلاشبہ ایک جواں سال دوشیزہ کا ہمدردی ومحبت بھرا تبسم اس کے زخم خوردہ دل کے لئے مرہم کا کام کر گیا۔ لیکن یہ بھی اس کم علم کی فہم سے پرے ہے کہ محض چند مشینی مرہم سے کیا واقعی ان ہاتھوں کا کھردراپن جو ہاتھوں کی ہتھیلی سے لے کر دل تک پھیلا ہوا ہے وہ ختم ہو سکتا ہے۔ اس کے کھردرے پن کا مرہم تو اس نسوانی کردار کے دو محبت بھرے بول، بدمست نگاہوں کے پیالے میں بھری ہوئی بادۂ شوق اور قیامت خیز اداؤں اور نگاہوں سے دور تک تاریکیوں کی ٹھنڈک سے منجمد ہوتے احساسات و جذبات کو گرما و برما کر اس کے اندر امکانات کے چراغوں کو روشن کرنا تھا۔ مگر ایسا عمل پذیر نہیں ہو سکا۔ چونکہ فن افسانہ نگاری خود اختصار کا متقاضی ہوتا ہے پھر شہاب دائروی مزید اسے مختصر کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ جس سے آپ کے افسانے میں حسن تو دوبالا ہو جاتا ہے لیکن معنویت پر اس اختصار کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ہاں! شہاب دائروی نے جو مکالمے مرتب کئے ہیں وہ واقعی پُر اثر اور معنی خیز ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

''کار کی سائڈ اسکرین پر بارش کے چھینٹے پڑ کر مٹ رہے تھے، یہ چھینٹے ایسے تھے جن کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ لیکن یہ چھینٹے جب زمین کے جگر میں اُترتے ہیں تو زمین سے سوندھی سی خوشبو اڑتی ہے۔ فصلیں اُگتی ہیں، کھیت لہلہاتے ہیں اور برسوں خوشیاں بکھرتی ہیں۔ دونوں کی افادیت میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے''۔ (کتاب ''شہتوت'' صفحہ۔۱۵۳)

گو کہ یہ فلسفیانہ انداز بڑا ہی معنی خیز اور حوصلہ افزا ہے۔ لیکن یہ اس کہانی سے کہاں تک ہم آہنگ ہے یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی یہ تو ایک بلاتر دید حقیقت ہے کہ معاشرے میں پانی کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ الغرض شہاب دائروی جہاں راست طور پر پُرمعنی انداز میں اپنی بات رکھنے پر قدرت رکھتے ہیں وہیں آپ فلسفیانہ طور پر بھی حقائق اُجاگر کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔ آپ نے ایک مقام پر کچھ اس طرح نعمان کی رودادِ حیات بیان کیا ہے۔

''میری بہت سی راتیں جاگتے ہوئے اس سوچ میں گزری ہیں کہ کون ہوں، چمن کے کس شاخ کا پھول ہوں پر آج تک نہیں جان پایا ہوں۔ اندھیروں میں بھٹکتا ہوا.....اُجالے کی تلاش میں نہ جانے کتنی بار کٹیہار اسٹیشن کے تین نمبر پلیٹ فارم پر سرگرداں رہا ہوں اور ہر بار وہاں سے لوٹ کر اپنے وجود سے نفرت کے اظہار پر روتا رہا ہوں''۔ (کتاب ''شہتوت''۔ صفحہ۔۱۵۶)

الغرض شہاب دائروی ایک پختہ کار اور تجربہ کار افسانہ نگار ہیں۔ آپ نے اپنے معاشرے کا بغائر نظر مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے آس پاس کے معاملات وواقعات سے خوب آگاہ ہیں۔ آپ کی نگاہ کسی عمیق شئے کی متلاشی نظر نہیں آتی ہے بلکہ معاشرے میں جو عام طور پر نظر آتا ہے اسے ہی آپ اپنے افسانوں کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ لیکن آپ چونکہ ایک کہنہ مشق اور بیدار نظر و بیدار مغز انسان ہیں اور ساتھ ہی بیانیہ پر بھی آپ کو قدرت حاصل ہے اس لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی آپ بڑے ہی دل آویز اور موثر طریقے سے پیش کرتے ہیں جس کے باعث آپ کے افسانوں پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ نے اس افسانے میں آئینے کے عکس کی طرح دل کی تہوں میں جھانکنے کی قابل ستائش سعی کی ہے۔ جو آپ کا خاصہ بھی ہے اور آپ کی انفرادیت بھی۔ آپ کے کئی افسانے ایسے ہیں جن میں آپ نے ایک نقطہ کو کائنات میں تبدیل کر کے اپنی فن کارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ☆☆☆

فن و شخصیت

رؤف خوشتر
موظف پرنسپا ل سرکاری کالج، بیجاپور
09538445870

اُردو کا پُر وقار خدمت گار

جس طرح شولاپور کا باشندہ شہر کی مصروف ترین گزرگاہ سات رستے کو نہیں بھول پاتا اسی طرح میں بھی عزیز القدر وقار احمد سے اپنے سات رشتے کو کیسے نہ یاد رکھوں۔ حالانکہ پروفیسر حضرات کو غائب دماغ کہا جاتا ہے۔ آپ کی پُر معلومات کے ذخیرہ میں مزید اضافہ کے لیے ان رشتوں کی وضاحت کرتا چلوں۔ بہتر ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ گنتے چلیں۔ رشتہ اول میرے ماموں عبدالوہاب منڈے واڑی (وکیل) موصوف کے خالو ہوتے ہیں۔ دوئم ان کے چچازاد بھائی عبدالقادر شیخ میرے خالو کہلاتے ہیں۔ سوئم میرے خالہ زاد بھائی اور بہنوئی انور حُسین کمشنر خوش قسمتی سے ان کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ چہارم وقار صاحب کے سچ مچ کے اچھے پڑوسی پروفیسر ڈاکٹر الیاس احمد پٹیل میرے خالہ زاد بھائی ہیں۔ پنجم میرے بڑے داماد خالد ظفر شیخ (حال مقیم دوبئ) ان کے حقیقی خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں۔ ششم عزیزم وقار احمد کے ہم زلف (عمر کے لحاظ سے اب کم زلف) کرجگی نہ صرف میرے ہم وطن (بیجاپور) ہیں بلکہ حسن اتفاق سے میرے ہم محلّہ بھی ہیں اور جناب ہفتم رشتہ جو میرے لیے مقدم معتبر اور معزز ہے وہ یہ کہ بقول کنہیالال کپور ہم دونوں برج بانو کے اسیر مداح اور خدمت گار ہیں۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وقار احمد سود و زیاں کے کاروبار یعنی بینک ملازمت میں دن بھر مشغول و منہمک رہتے ہوئے بھی شام ہونے تک کیسے اپنے آپ کو نفع سے زیاں کے کاروبار میں کامیابی سے ڈھال لیتے ہیں اور بینک کے عملہ سے زیادہ وہ شاعروں اور ادیبوں کے بیچ اپنے آپ کو زیادہ خوشی محسوس کرتے تھے، چونکہ نہیں اُردو کا معاملہ اب زیاں کا معاملہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے ہر کوئی اس وادئی پرخار میں قدم رکھنے کو ڈرتا ہے مگر داد دیجئے موصوف کو کہ وہ دن بھر بینک میں گلابی گلابی نوٹوں سے کھیلتے ہوئے شب کو اپنی نوٹ آشنا انگلیوں میں اُردو کی کتاب تھما کر مشغول مطالعہ رہتے تھے۔ جب کہ اکثر اساتذہ تک نہیں چیک بُک تھامے رہتے ہیں۔

میں جب بھی شولاپور آتا ہوں اور اکثر آتا ہوں اس لیے کہ شولاپور میرے لیے نانا شہر جاناں وطنِ نانی اور وطنِ ثانی ہے تو میں وقت نکال کر عزیزم وقار احمد سے ملتا ہوں تو مجھے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میں بینک کے سابق افسر سے مل رہا ہوں بلکہ مسرت ہوتی ہے کہ اردو کے ایک خاموش خدمت گار سے ملاقات کر کے فیض یاب ہو رہا ہوں۔ اُن کی اُردو زباں کے تئیں حقیقی محبت اور اس سے زیادہ حقیقی خدمت ہم جیسے اُردو پروفیسروں کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ جن کی یافت ہی نہیں بلکہ تدریسی دریافت بھی کئی صفروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ انھوں نے مجھے بحیثیت رکن مہاراشٹر اُردو اکیڈمی اکل کوٹ کے ایک سمینار میں مدعو کیا تھا۔ ان کے ہمراہ کار میں اکل کوٹ کا خوشگوار سفر درپیش آیا تھا۔ دورانِ سفر اُردو ادیبوں اور شاعروں سے متعلق ان کی وسیع معلومات سے میں خوشگوار حیرت میں ڈوب گیا تھا۔ ہونٹوں میں تبسم اور دھیمی انداز میں بات کرنے کا چلن سب کو متاثر کرتا ہے۔ سب کو لے کر کام کرنے کا جذبہ اُن میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اس لیے اُن کی سرکردگی میں اُردو کی ہر تقریب کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اردو زبان کی خدمت کرتے رہیں گے تاکہ انھیں پُرعزم دیکھ کر ہم سب میں بھی اردو نوازی کا جذبہ جاگے اور اُردو سے غفلت کا خیال بھاگے۔ شولاپور میں ان کی اُردو خدمات گراں قدر ہیں جو لائق تحسین ہی نہیں لائق تقلید بھی ہے۔

فی زمانہ تھوڑی بھی اردو کی خدمت بڑی خدمت ہی کہلائے گی۔ اور وقار احمد شیخ کی اُردو خدمت بڑی خدمت ہی ہے۔

پانی کو ترستی ہوئی فصلوں سے یہ پوچھو۔ بارش کی ہر ایک بوند گُہر ہے کہ نہیں ہے☆

انجینئر محمد عادل فراز
ہلال ہاؤس 4/114۔ نگلہ ملاّح۔ سول لائن۔ علی گڑھ (یوپی)
موبائل: 09358856606

وفا نقوی کے کلام میں سائنس

شاعری کی دنیا ایک ایسی طلسماتی دنیا ہے جو اپنے ذرے ذرے میں بے کراں وسعت رکھتی ہے جس کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچنا سہل نہیں ہوتا۔ جب ایک با شعور اور صاحبِ فہم قاری اس راہ کا مسافر ہوتا ہے تو لمحہ لمحہ نئی فکر سے آشنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایسے ایسے ابواب روشن ہوتے ہیں کہ جن تک عام قاری رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ پل بھر میں صدیوں کی مسافت طے کر کے اہلِ زمانہ کو متحیر کر دیتا ہے۔ ایک ایسا صاحبِ نظر جس کا مختلف علوم و فنون سے رشتہ ہو اور مطالعہ وسیع ہو وہی شاعری کی تہہ میں اُتر کر گوہرِ مراد حاصل کرتا ہے۔ شاعری جہاں ایک فن ہے وہیں شعر شناسی بھی کسی طرح فنِ شاعری سے کم نہیں۔ اچھی شاعری محدود نہ ہو کر زمان و مکان کی قید سے باہر ہوتی ہے اور مختلف زاویوں سے متاثر کرتی ہے۔

بظاہر شاعری اور سائنس کا الگ الگ میدان ہے لیکن پھر بھی ایک منطقی شعور کم و بیش سائنس اور ادب دونوں میں اپنے ہونے کی مثال پیش کرتا ہے اور سماج کو ترقیوں سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ جدید دور میں سماج کی ترقی کا دار و مدار سائنس کی ترقی پر مبنی ہے اور اس کی ترقی معاشرے کی ترقی ہے۔

اگر ہم اردو غزلوں پر غور و فکر کریں تو ہم پائیں گے کہ دورِ حاضر کی غزلیں ہوں یا دورِ قدیم کی غزلیں ان میں سائنسی رجحانات کسی نہ کسی طریقہ سے موجود ہیں۔ بس ہمیں شعروں کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنے میں شاعر اور سائنسداں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن دریافت کا ایک مشترکہ احساس، اور قدریں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ جس طرح ایک ماہر سائنس داں اپنے غور و فکر اور تجزیہ سے کسی شے کو دریافت کرتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی اپنے تجربات و تجزیات کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا ہے۔ انگریزی ادب کے شاعر اور سائنسی مفکر ''شریک کارکولرج'' کے مطابق ایک شاعر کی ذہنی صلاحیتیں ایک سائنسداں سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہیں وہ 1802 میں چھپنے والے مجلّہ "Lyrical Ballads" میں ایک جگہ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''سر آئزک نیوٹن جیسی پانچ سو ارواح ملائی جائیں تو ملٹن یا شیکسپئیر کی ایک روح بنتی ہے۔''

آج کے دور کا انسان ان ترقیوں کی راہ پر گامزن ہے جن کو قدیم دور کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آج سمندروں کی گہرائی، اور خلاؤں کی بلندی پر جا پہنچا ہے، اور چاند اور مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے، اور آج بھی اس کی جستجو خوب سے خوب تر چیزوں کی تلاش میں جاری ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کی نظر کہاں جا کر ٹھہرتی ہے۔

ہے آرزو کہ ہو بہتر سے بہتری کا سفر۔ نظر کہاں پہ ٹھہرتی ہے دیکھنا یہ ہے
(وفا نقوی)

اس مضمون میں وفا نقوی کی شعری کاوشوں کے حوالے سے شاعری اور سائنس کے ربطِ باہم پر نگاہ کرنا مقصود ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وفا نقوی کی شعری صلاحیتیں کس حد تک قارئین کو متاثر کر سکتی ہیں۔ وفا نقوی کا نام سید بصیر الحسن نقوی ہے آبائی وطن شکار پور ضلع بلند شہر ہے۔ علی گڑھ جیسی علمی و ادبی سرزمین ان کا وطنِ ثانی ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔ اکثر و بیشتر جرائد و رسائل میں ان کی شاعری چھپتی رہتی ہے۔ جلد ہی ان کا مجموعہ کلام ''رنگ خوشبو صبا'' منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

سائنسی انکشافات کی بنا پر 118 عناصر کی دریافت ہو چکی ہے۔ تمام عناصر میں تین چوتھائی حصّہ دھاتیں اور ایک چوتھائی ادھاتیں ہیں۔ ہماری صحت کی حفاظت اور زندگی کے لئے بھی یہ بہت اہم ہیں۔ انسانی جسم میں 99% عناصر جو بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں ان میں ''آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، اور فاسفورس'' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ پوٹاشیم، گندھک، سوڈیم، میگنیشیم، تانبے، زنک، سیلینیم، مولبڈینم، فلورین، کلورین، آئیوڈین، مینگنیج (Manganese) کوبالٹ، آئرن جیسے عناصر بھی ہماری انسانی جسم میں موجود ہوتے ہیں جو اس کی نشو نما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان عناصر کی کمی یا زیادتی کے سبب انسانی صحت متاثر ہو سکتی ہے۔ اور ہمارے جسم میں بہت سی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ''ہڈیوں کا کمزور ہونا، اوسموٹک توازن کا بگڑنا، دانتوں کی بیماریاں، لیور کا متاثر ہونا، ہیموگلوبن کی کمی ہونا، گھیگھوا (Goitre) کا بننا'' وغیرہ وغیرہ۔ گویا جس انسان کو شاعری میں خاک کے پتلے سے تشبیہہ دی جاتی ہے وہ صرف خاک کا وجود نہیں ہے بلکہ اس کا وجود مختلف اقسام کے عناصر سے وجود میں آیا ہے۔ اور اس کی ترتیب میں آیا ذرا سا بدلاؤ زندگی کے لئے پریشانیاں پیدا کر سکتا ہے۔

خاک انسان کا وجود نہیں۔ سب یہ ترتیب ہے عناصر کی

وفا نقوی کا یہ شعر انسانی وجود میں اہم رول ادا کرنے والے عناصر کی اہمیت کو بہت ہی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر میں آیا لفظ ''خاک'' جیسا لفظ بھی بہت سے معنی و مفاہیم سمیٹے ہوئے ہے مثلاً جو عناصر مٹّی یعنی خاک میں بھی

موجود ہوتے ہیں وہ کم وبیش انسانی جسم میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ہماری زندگی کو رواں دواں رکھنے میں لہو یعنی خون کا بہت بڑا کردار ہے۔اس کی تعریف میں شاعروں اور ادیبوں نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔خون ہمارے جسم میں گردش کرنے والا ایک سیال مادّہ ہے جس میں مختلف اقسام کے خلیات ،غذائی و دیگر مادے تیرتے رہتے ہیں اور پورے جسم میں خون کے ساتھ چکّر لگاتے ہیں اس عمل کو دورانِ خون (Blood circulation) کہتے ہیں۔اس میں موجود سیال (Fluid) کو پلازمہ (Plasma) کہتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ خون میں تین اقسام کے خلیات بھی موجود ہوتے ہیں جن کو سرخ خونی خلیات (Red blood cells) ،سفید خونی خلیات (White blood cells) سوئم صفیحات (Thrombocytes) کے نام سے جانا جاتا ہے۔عام آدمی کے لئے خون صرف ایک سرخ رنگ کا سیال مادّہ ہے جو اس کی رگوں میں بہتا ہے۔لیکن یہ بات بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ کس طرح یہ سیال مادہ ہمارے پورے جسم میں سفر کرتا ہے۔اس دوران بہت سے حیران کن معجزے ہمارے جسم میں رونما ہوتے ہیں۔مثلاً جتنی دیر میں ہم پلکیں جھپکتے ہیں اتنی دیر میں کم سے کم بارہ لاکھ سرخ خلیے اپنے افعال مکمل کر کے مر جاتے ہیں۔اور اسی دوران اتنے ہی نئے خلیے بن کر ہمارے خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔یہ کام ہماری ہڈیوں کا گودا (Bone Marrow) انجام دیتا ہے۔سرخ خلیوں کی عمر 120 دن ہوتی ہے اس دوران ہمارا خون 75 ہزار مرتبہ ہمارے دل سے جسم تک اور جسم سے دل تک کا سفر طے کر چکا ہوتا ہے۔ہمارے جسم میں موجود پلازمہ اور سرخ خلیے ایک منٹ میں تقریباً 72 مرتبہ اپنے صارفین کو اُن کی ضرورتیں مکمل کرتے ہیں۔اس دوران انھیں 75 ہزار لمبی شریانوں اور وریدوں سے گزرنا ہوتا ہے۔وفا نقوی بہت ہی خوب صورتی سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گھروں میں آئے پلٹ کر تو یہ ہوا احساس ۔ ہمارے ساتھ ہمارے لہو کی ہجرت تھی

''ہمارے ساتھ ہمارے لہو کی ہجرت تھی''مصرع میں آیا لفظ ''ہجرت'' خون کو جسم کے مختلف اعضاء تک پہنچانے اور اس کی کارکردگی کی طرف اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

شہری پھیلاؤ (Urbanization) ، بڑھتی ہوئی آبادی اور صنعتی نظام نے ماحولیات کی آلودگی کے ساتھ ساتھ سمندر،اور زیرِ زمین موجود پینے کے پانی کے ذخیروں کو بھی متاثر کیا ہے۔جس کے سبب آج پینے لائق پانی کی دستیابی کا مسئلہ در پیش ہے۔ہمارے ملک ہندوستان کی حکومتیں بھی اس کے لئے بڑے اقدامات کر رہی ہیں ساتھ ہی 2015-16 کو پانی کے تحفظ (Water Conservatio) سال کے طور پر منایا گیا ہے۔یہ بات ہم کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پینے کے پانی کا تحفظ کرنا زندگی کے لئے بہت لازم ہے۔دنیا میں تین چوتھائی اور تقریباً 70 فی صد حصّے میں سمندر ہونے کے باوجود اس کے کھارے ہونے کی وجہ سے اس کے پانی کو پینے کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔شہروں میں لوگوں کو مجبور ہو کر پینے کے پانی کے لئے ایک اچھی خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔جھیلوں میں مچھلیوں کی آبادی میں تیزی سے کمی واقع ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہاں پر ہونے والی بارش میں تیزابیت زیادہ ہے۔کیوں کہ تیزابی بارش کی صورت میں مچھلیوں میں انڈے دینے کی اور ان کے بچوں کے زندہ رہنے کی صلاحیت کافی گھٹ جاتی ہے۔فیکٹریوں اور ملوں سے ٹھوس اور سیال مادے جب نالیوں کے ذریعہ دریاؤں میں جا ملتے ہیں یا زرعی مقاصد کے لئے ڈالی گئی کھاد، چھڑکاؤ کی ہوئی جراثیم کش دوائیاں اور فضا میں پائے جانے والے مرکبات بارش کے پانی کے ساتھ بہہ کر دریاؤں میں شامل ہوتے ہیں تو ان کا پانی آلودہ ہو جاتا ہے۔یہ پانی نہ شہریوں کے استعمال کے لائق رہتا ہے اور نہ اس کو آبپاشی اور دیگر صنعتوں کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔اگر آلودہ پانی کو پینے کے استعمال میں لایا جائے تو کئی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں جن میں ہیضہ،ٹائفائیڈ ،جگر اور پیٹ کی بیماریاں قابلِ ذکر ہیں۔اس پانی میں مچھلیوں کے علاوہ آبی پودوں اور جانوروں کا زندہ رہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔تحقیق کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں سمندری پانی کے آلودہ ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں تقریباً ایک ہزار آبی پودوں اور جانداروں کی نسلیں ناپید ہو چکی ہیں۔یورپی ماہرین کے مطابق پانی کے جہازوں سے نکلنے والی گندک پر مشتمل دھواں آئے دن تیزابی بارش برسانے کی وجہ بنتا ہے۔سائنس دانوں نے اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ فضاء میں میتھین (Methane) گیس سے متاثر ہونے والی تیزابی بارش گہرائی میں پائے جانے والے کئی جانداروں کے ناپید ہونے کا سبب بنی ہے وفا نقوی اس حقیقت کی عکّاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مچھلیوں میں زہر کیسے آ رہا ہے رات دن ۔ آج پانی میں ذرا اُترا تو اندازہ ہوا

آبادی میں اضافہ ہونے کے سبب شہروں کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی شہر خوب پھیلتے گئے اور جنگلات سمٹنے لگے۔پیڑ پودوں کی بے تحاشہ کٹائی ہونے لگی۔لیکن انسان یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ پیڑوں پر نہیں بلکہ اپنے پیروں پر کلہاڑی چلا رہا ہے۔اپنے قدرتی ماحول اور زندگی کو بربادی کی راہ پر گامزن کر رہا ہے۔افسوس کا مقام ہے کہ اس نے اپنے لالچ کی خاطر پیڑ پودوں سے حاصل شدہ فائدے کو درکنار کر دیا۔اس نے جس تیزی سے جنگلات کا خاتمہ کیا اتنی رفتار سے پیڑ پودوں کو نہیں لگایا۔ماحول سے آلودگی دور کرنے کے لئے آج زیادہ سے زیادہ درخت لگانے کی ضرورت ہے۔کیوں کہ ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کے لئے جنگلات بے حد لازمی ہیں۔دراصل جنگلات ایک ایسا قدرتی سرمایا ہے جس سے انسان کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔پھر بھی ترقی اور جدیدیت کی حمایت کرنے کا دعویٰ کرنے والے افراد آج اس کی کٹائی کر رہے ہیں۔ایک وقت ہوا کرتا تھا جب زمین کا 70 فی صد رقبہ 12 ارب 80 کروڑ ہیکٹیر جنگلات سے بھرا ہوا تھا جو آج سکڑ کر صرف 16 فی صد 2 ارب ہیکٹیر ہی رہ گیا ہے۔ماہرین کے مطابق جنگلات کی اندھا دھند کٹائی کے سبب بارش کی مقدار،زیرِ زمین پانی کی سطح اور پانی کے دیگر قدرتی ذخیروں میں کمی آئی ہے۔جس کے نتیجے کے طور پر سیلاب،خشک سالی،زمین کا کھسکنا (Land Slide) جیسے حالات رونما ہونے لگے ہیں۔

ماہرینِ نباتات و جنگلات کے مطابق 50ٹن وزن کا ایک صحت مند درخت اگر 50 سال تک زندہ رہتا ہے تو وہ 2لاکھ 50ہزار روپوں کی قیمت کی آکسیجن، 20ہزار روپوں کی پروٹین، 2لاکھ 5ہزار روپوں کے برابر مٹّی کا تحفظ، 3لاکھ روپوں کے برابر آبی کنٹرول 2لاکھ 50 ہزار کے برابر پرندوں کی حفاظت اور ساتھ ہی کیڑوں، پتنگوں کو بھی محفوظ کرتا ہے۔ اگر درخت سے حاصل شدہ پھل، پھول، لکڑی اور جڑی بوٹیوں سے حاصل شدہ آمدنی کا اندازہ لگایا جائے تو ایک درخت ہم کو تقریباً 18لاکھ روپوں کا فائدہ پہنچاتا ہے۔ درخت زمین کے محافظ ہوتے ہیں۔ ان کی جڑیں پانی کو جذب کر لیتی ہیں اور وہ دور دور تک پھیل کر مٹّی کے کٹاؤ کو روکتی ہیں۔ اور وہ مٹّی کی زرخیزی کو برقرار رکھتے ہیں۔ جس زمین پر پیڑ پودے اور ہریالی نہیں ہوتی اس کی زرخیزی میں کمی واقع ہونے لگتی ہے ساتھ ہی سیلاب اور بارش کے پانی کے سبب مٹّی کے کٹاؤ کے امکانات بڑھنے لگتے ہیں۔ درختوں کی اندھادھند کٹائی انسانی زندگی کے لئے بہت بڑے خطرہ کی وجہ بنتی جا رہی ہے۔ وفا نقوی اپنے اشعار میں درختوں کی کٹائی کے سبب ہونے والے نقصانات کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

درخت کاٹنے والوں نے یہ نہیں سوچا۔ کہ اپنی موت کا سامان کر رہے ہیں ہم
تو دۂ خاکِ بدن آبِ رواں خوب ہوا۔ اب کے برسات میں مٹّی کا زیاں خوب ہوا

قوس قزح کا بننا ایک انوکھا اور حسین منظر ہوتا ہے۔ اس کا وجود آسمان میں اکثر بارش ہونے کے بعد عمل میں آتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے قوسِ قزح آسمان میں اس وقت دکھائی دیتا ہے جب بارش ہونے کے بعد پانی کے قطرات ہوا میں ٹھہر جاتے ہیں، سورج کی کرنیں جب ان قطرات پر پڑتی ہیں تو قطرے منشور (Prism) کی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح منشور روشنی کی کرنوں کو مختلف رنگوں میں تقسیم کر دیتا ہے بالکل اسی طرح یہ پانی کے قطرات سورج کی روشنی کو سات مختلف رنگوں کی شعاعوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جس کے سبب ہماری آنکھوں کے سامنے ایک خوب صورت اور دلکش قوسِ قزح یا دھنک (Rain bow) ظاہر ہوتا ہے یہ ایک کمان کی شکل میں ہوتا ہے اس لئے اس کو ''اندردھنُش'' سے بھی پکارا جاتا ہے۔ وفا نقوی کی غزل کا یہ شعر دھنک کے رنگوں کے وجود میں آنے سورج اور آسمان کے باہمی اور انوکھے رشتہ کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

میں اُفق ہوں مرا سورج سے ہے رشتہ گہرا۔ ایک دو رنگ نہیں ساری دھنک ہے مجھ میں
(وفا نقوی)

انسانی دماغ ایک حیرت انگیز معجزہ ہے۔ بظاہر یہ ہمارے جسم کا ایک حصّہ ہے لیکن ہماری شخصیت، ہمارے ردِ عمل، پسند اور ناپسند، صلاحیتوں، سوچ اور فکر' جذبات' احساسات' خیالات سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر کے چلنے اور کام کرنا سب دماغ کے احکامات کے مطابق عمل کرنا ہے یعنی ہمارے جسم کی ہر حرکت اس کے حکم کے طابع ہے۔ بھوک، پیاس کا لگنا، سردی، گرمی کا محسوس ہونا، ڈر اور خوف، گھبراہٹ وغیرہ یعنی ہر خواہش اور موڈ کے بارے میں یہی ہم کو معلومات فراہم کرتا ہے۔ جب انسان جزبات و احساسات کی منزل سے گزرتا ہے یا بہت زیادہ خوش ہوتا ہے تو اس مرحلہ پر انسان کے دل کی دھڑکن بڑھنا لازمی ہوتا ہے کیوں کہ اس وقت دورانِ خون میں تیزی آجاتی ہے جو ایک فطری عمل ہے۔ لیکن اس عمل کا تعلق بھی ہمارے دماغ کے سبب ہی ممکن ہے۔ جب انسان کسی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے یا اس پر جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس وقت انسانی دماغ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ وفا نقوی اس بات کی ترجمانی اپنے ایک شعر میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کیا جانے کب اترنے لگے وہ دماغ پر۔ کوئی جنوں کا وقت مقرر نہیں ہوا

بغور دیکھیں تو مندرجہ بالا شعر میڈیکل سائنس کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بات کی تصدیق آج کے Neurologists بھی کرتے ہیں برطانوی Neurologists کا یہ کہنا ہے کہ عشق ایک خاص دماغی عمل ہے جس کے دوران دماغی حصّے متاثر ہوتے ہیں اور دماغی حصّوں میں تحریک تیز ہو جاتی ہے۔

اسپیس ریسرچ میں مصروف ناسا جیسی ایجنسیوں نے اپنے تجربات اور دور بینوں کے مشاہدات کے ذریعے اس بات کی ترجمانی کی ہے کہ ہماری کائنات میں صرف ہمارا ہی سورج اور نظامِ شمسی نہیں ہے اس کے علاوہ بھی کائنات میں اربوں کہکشاؤں اور آفتابوں کا وجود موجود ہے۔ نظامِ شمسی میں آفتاب کے ساتھ ساتھ سیارے موجود ہیں اور ان سیاروں کے اردگرد چاند گردش کر رہے ہیں جن کا حقیقی اندازہ لگانا بھی دشوار ہے لیکن اگر ہمارے نظامِ شمسی میں سیاروں کے 63 چاند دریافت ہو چکے ہیں تو ہماری کائنات میں موجود ان لاکھوں ستاروں کے نظام میں کروڑوں چاندوں کی موجودگی سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ہیں کہیں چاند اور کہیں تارے۔ دیکھتا ہوں میں آسماں کتنے

موصوف کا یہ شعر آسمانوں اور خلاؤں کی وسعت کا ترجمان ہے۔ جس طرح ہماری کائنات لگاتار پھیل رہی ہے اسی طرح اس کا خاتمہ بھی ایک ممکنہ صورت ''بگ کرنچ'' (Big Crunch) کے سبب ہوگا جس میں ایک عظیم دھماکا ہوگا اور مسلسل پھیل رہی یہ کائنات سکڑنا شروع کر دے گی یہ عمل بالکل ''بگ بینگ'' کے عمل کا الٹا ہوگا جس کے نتیجہ میں کائنات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وفا نقوی بہت ہی خوب صورت انداز میں اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

رشتہ نہ ٹوٹ جائے خلاء کے مکان سے۔ سورج کا بوجھ اٹھتا نہیں آسمان سے
(وفا نقوی)

المختصر اختصار کے مدّنظر آخرِ مضمون میں یہ بات کہہ کر اختتام کیا جاتا ہے کہ شاعر اور سائنس داں میں جہاں بہت سی باتوں میں فرق ہے وہیں ان میں بعض مقامات پر یکسانیت بھی پائی جاتی ہے چونکہ وہ دونوں اپنی آس پاس کی دنیا اور اپنے ماحول کو اپنی مخصوص نگاہوں سے دیکھتے ہیں ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سائنس داں حقیقتوں کے انکشافات سے اپنی تحقیق آگے بڑھاتا ہے اور ایک شاعر خیالات و تصورات کی دنیا کو حقیقت بنا کر اپنے وجود کا حصّہ بنا لیتا ہے۔

☆☆☆

حقانی القاسمی
نئی دہلی

فن و شخصیت

(نیاز علی نیاز بالاپوری کی شاعری پر مختصر نوٹ)

انسانی کائنات کے ہر فرد کے دروں میں ایک آہنگ ہوتا ہے اور اسی آہنگ کا اضطراب اسے اظہار کی راہیں تلاش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ شکیب جلالی کا ایک شعر ہے:

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ سب بکھیر دیا۔ پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

ہر انسان اپنے ذہنی اضطراب وارتعاشات کو کوئی نہ کوئی شکل ضرور دینا چاہتا ہے۔ اس کی صورت چاہے شاعری/نثر جیسی ہو یا آڑھی ترچھی لکیروں کی طرح۔ آرٹ ہی انسان کی ذات اور ضمیر کو زندہ رکھتا ہے۔ نیاز بالاپوری کا تخلیقی محرک بھی ان کی ذات میں پلنے والا کرب اور ضطراب ہی ہے اور اسی اضطراب سے نجات کی راہ انھوں نے مابعد الطبیعاتی عمل میں تلاش کی ہے۔ اپنے ایک شعر میں انھوں نے اس جستجو کا جواز بھی پیش کیا۔

خدا نے توڑ دیا ہے مری خموشی کو۔ اگر میں شعر نہ کہتا تو مر گیا ہوتا

زندگی جینے کا یہی جذبہ انسان کا رشتہ تخلیقی احساس و اظہار سے جوڑتا ہے۔ تخلیق انسان کو حبس، گھٹن سے نجات دلاتی ہے اور زندگی کے کیف و کم سے روشناس کراتی ہے۔ نیاز بالاپوری کی پوری شاعری حیات کے حرکی عناصر کی جستجو سے عبارت ہے۔ ان کے یہاں جو جذبے کی شدت ہے وہ کبھی کبھی عروضی زنجیروں کو بھی توڑ دیتی ہے کہ دراصل احساس کی طغیانی کسی قسم کی قید و بند کو برداشت نہیں کرتی۔

نیاز بالاپوری کی شاعری میں پاکیزہ جذبوں کے چراغ جلتے ہیں۔ ان کی شاعری قلب ونظر کی پاکیزگی اور نفس کی طہارت سے روشن ہے۔ ان کا پورا شعری سلسلہ مراقباتی کیفیتوں سے جڑا ہوا ہے۔ ذوقِ یقیں سے جڑی ہوئی یہ ایسی شاعری ہے جہاں شکستوں، ہزیمتوں اور مایوسیوں کے اندھیرے میں رجا اور امید کے دیئے جلتے ہیں مگر یہ دیئے آنسوؤں کی مٹی سے بنے ہیں۔ وہی مٹی جو عجز و فروتنی کی ایک علامت بھی ہے۔

نیاز بالاپوری کی شاعری میں ایک درد نہاں ہے۔ یہ درد فرد کا بھی ہے، اجتماع کا بھی ہے، ذات کا بھی ہے، کائنات کا بھی۔ حزن نیاز کی شاعری کا ایک حرکیاتی عنصر ہے۔ یہ اس دکھ کا بیانیہ ہے جو انسانی کائنات سے جڑا ہوا ہے۔

رنج و غم والم سے گزرنا پڑا مجھے۔ ہر گام چیخ چیخ کے رونا پڑا مجھے

کہاں ہوتی ہے جرأت ہر کسی میں۔ ہمیں رنج والم میں بولتے ہیں

مجھے ہنسنا سکھایا ہے کسی نے۔ مگر برسوں رُلایا ہے کسی نے

بڑی مشکلوں سے خوشی جو ملی تھی۔ مقدر سے نذرِ الم ہو گئی ہے

نیاز کی شاعری میں یہی اشک ہیں جو شبد ستاروں میں ڈھل گئے ہیں اور یہی وہ رنج ہے جس نے ان کے تخلیقی وجود کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

نیاز بالاپوری نے اپنے شعروں میں اس کائناتی المیے کو بیان کیا ہے جسے آئینۂ ذات میں بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ہر فرد ایک کائناتِ اصغر ہے اور ہر فرد میں ایک کائنات اکبر آباد ہے۔ یہ عرفانِ ذات اور معرفت نفس کی شاعری ہے:

آپ اپنا پتہ جو پالیں نیاؔز۔ پھر کوئی جستجو نہیں ہوتی

اس شاعری میں دعاؤں کی وہ دستک بھی ہے جس سے سارے در کھل جاتے ہیں اور جو انسانوں کی تقدیر بدل دیتی ہے۔

سب تدابیر کو جدا کر کے۔ کام آخر ہوا دعا کر کے

لہو کے اشک بہانے سے بات بنتی ہے۔ دعائیں عرش پہ جانے سے بات بنتی ہے

ان کی شاعری میں انسانی اقدار کی شکستگی، مردم بیزار معاشرے پر طنز ہے اور زوالِ آدمیت۔ رشتوں کے انہدام کے بیان کے ساتھ ساتھ تیرگیٔ حیات کا نوحہ اور باطن کی تاریکیوں کا مرثیہ بھی ہے:

وہ جہالت کا زمانہ اس قدر جاہل نہ تھا۔ آدمی کے بھیس میں یوں آدمی قاتل نہ تھا

خلوص، پیار، محبت بھلا کے بیٹھے ہیں۔ انھیں سے پوچھئے کیا کیا گنوا کے بیٹھے ہیں

جیے ہزار مگر دل میں رہ گئی حسرت۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ ہم جیے کیسے

ایک لمحہ مرے دکھ میں تم نہ رہے۔ میں ہمیشہ تمھاری خوشی میں رہا

وفاؤں کے ہم نے دیئے بھی جلائے۔ مگر زندگی میں اُجالے نہ آئے

جانے کس حال میں پھر لوگ اکیلا کر دیں۔ بھیڑ ہے بھیڑ فقط کام نکل جانے تک

باہر سے چکا چوند بظاہر ہے یہ دنیا۔ صد حیف کہ روشن کبھی باطن نہ ملے گا

برار میں سخن چراغ جلانے والوں میں ایک نام نیاز بالاپوری کا بھی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "مشت گل" ان کے جذبات واحساسات کا آئینہ ہے۔ اس میں ان کی ذات

Unfiled Notes Page 42

کا انعکاس ہے اور کائنات کا عکس بھی۔ وہ جن تجربات وحوادث سے گزرے ہیں انھیں شاعری کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر پاکیزہ طبیعت کے حامل ہیں اس لیے ان کی شاعری میں نہ حکایتِ گل وبلبل ہے اور نہ ہی داستانِ عشق ومحبت۔ یہ مکمل طور پر اصلاحی اور اخلاقی اقدار کی شاعری ہے۔ اس شاعری کی سمت وہی ہے جو خواجہ الطاف حسین حالی نے "مقدمہ شعروشاعری" میں متعین کی تھی۔ اس میں سادگی بھی ہے صداقت بھی اور وہ جوش بھی جو قومی اور ملی بیداری کے لیے لازمی ہے۔

نیاز بالاپوری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی عمر کے آخری پڑاؤ میں اپنے جذبات اور احساسات کی زنبیل کو اس نسل کے حوالے کر دیا ہے جو اس کی روشنی میں اپنی زندگی کی صحیح اور صالح سمتوں کا تعین کر سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ نیاز بالاپوری کا یہ شعری مجموعہ "مشتِ گل" صرف برار نہیں بلکہ برار سے باہر بھی مقبول ہوگا اور ان کی دعا اور دل کی حقیقی روشنی دور دور تک پہنچے گی۔

☆☆☆

(ترانہ جاوید کا بقیہ)

اور یہ دو رباعیاں جس میں آج کی انسانی زندگی کا کرب اور معاشرتی زندگی کی مثبت ومنفی سوچ کو درشایا گیا ہے۔

پھیلا ہے جہاں تک آسمان دیکھا۔ حیرت کا ہے نشان جہاں تک دیکھا
جس سمت بھی اُٹھی ہیں نگاہیں مری۔ دکھ درد کا ہے نشان جہاں تک دیکھا

☆

فردا کے خوابوں کا گھروندا ٹوٹا — تھا بھائی پہ اپنا جو بھروسہ ٹوٹا
جامی سہ رہا ہے پہلے کا جواز — گر حال سے خود اپنا رشتہ ٹوٹا

عہد حاضرہ کا ننگا سچ بھی ملاحظہ کریں:

اترا ہے زمیں پر یوں ٹی وی کا عذاب۔ لاکھوں بچے ہوئے دنیا میں خراب
یکسوئی سے سب دیکھتے ہیں ننگا ناچ۔ باقی نہ رہا والد و دختر میں حجاب

عورت کی اصل تصویر بھی ملاحظہ ہو:

اللہ نے کیا خوب بنائی عورت۔ اوصاف حمیدہ سے وبا پر فطرت
مغرب نے مگر اس کیا ہے بے شرم۔ وہ گھر نہیں کوٹھے کی ہے ہی زینت

آخر میں دو تین جملے رباعی کے وزن میں کئے گئے جامی کے تجربات کے تعلق سے عرض کردوں تو بیجا نہ ہوگا۔ جہاں تک سانیٹ اور ترائلے کا سوال ہے یہ دونوں اصناف یورپی ادب سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان کے لئے کسی بھی بحر میں سرپٹ دوڑنے کی گنجائش برقرار ہے کہ عروض دانوں نے اس کے لئے بھی مخصوص وزن کی قید نہیں لگائی ہے۔ جہاں تک رباعی کی آزادی کا سوال ہے اس کی قبولیت اور عدم قبولیت کا انحصار عروضیوں کی اجازت پر ہے کہ لنگڑاتی ہوئی رباعی کو وہ کتنا قبول کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اس کی بحر رباعی والی ہی ہے اور وزن بھی۔ مگر کیا ایک مصرعے ہی کے ارکان کی کمی گوارا کر کے وہ آزادی رباعی کو دینے کو آمادہ ہوں گے؟ عبدالمتین جامی کی اختراعی کوشش کے لئے میدان کھلا ہوا ہے۔ شرط ہے اپنی اختراعات کو منوانے اور سند دلوانے کی۔ میری نیک خواہشات.... جامی کے ساتھ ہیں۔

☆☆☆

منیر سیفی
Samanpura.MalikLane
B.V.C Patna-800014
Mob-9835268274

خورشید عالم کے سانحۂ ارتحال پر
قطعاتِ تاریخ

رویا کرے گا اب اسے برسوں عظیم آباد
روشن تھا تیرگی میں محبت کا جو چراغ
سیفی کو یہ مصرعِ تاریخ رحلتش
"گل ہوگیا ہوا میں صحافت کو جو چراغ"
2017ء

آناً فاناً جو نہیں۔ ہونا تھا ہو گیا
جاگا تھا عمر بھر کا ہوئی صبح سو گیا
احباب کہہ رہے ہیں کہ تاریخ کہہ منیر
خورشید "کیوں غروب دمِ صبح" ہوگیا
1438ھ

کیا پتہ ان کو گزرتی ہے کیا محنت کش پر
مٹھیاں بند جو رکھتے ہیں خزانے والے
صبح کے ۹ بجے خورشید یہ کہہ کر ڈوبا
یوں بھی دنیا سے چلے جاتے ہیں جانے والے

☆

وہ صحافی، شاعرِ جادو بیاں
نیک طینت، سیدھا سادہ آدمی
دفعتاً بزمِ جہاں سے اٹھ گیا
سید خورشیدِ علام کا کوی

☆ ☆ ☆ ☆

غـــــزلیـــــات

اختؔر شاجہاں پوری
RangeenChaupal.
Shahjahanpur-242001

نہ دستک ہے نہ آوازِ پا ہے
کرشمہ سازئِ بادِ صبا ہے
جنوں ہے یا اسے پاسِ اَنا ہے
خلوصِ بے نہایت سے خفا ہے
مجھے قیدِ قفس سے مت ڈراؤ
یہ آزادی بھی مجھ کو اِک سزا ہے
کبھی گھر سے نکل کر بھی تو دیکھو
کہ اب کس رُخ کو دنیا کی ہوا ہے
کفِ افسوس ملتے ہیں مسیحا
ترے بیمار کو کیا ہو گیا ہے
مرے دستِ جنوں میں زخم کب ہیں
تمناؤں کا میری خوں بہا ہے
پرندوں نے یہ کیا ٹھانی ہے اخترؔ
فضاؤں میں بسیرا کر لیا ہے

حیرتؔ فرخ آبادی
Khosla House
North Office Pare
Dorauda(Ranchi)834002

ہم تو کبھی ایسے نہ تھے یہ کیا ہوادیوانگی
سادہ سی اک پہچان، کیوں اُلجھی بتادیوانگی
مندر میں جا مسجد میں جا گرجے میں جا مرضی تری
تیرا خدا تیرے لئے میرا خدا دیوانگی
کچھ میرے پارسا ناراض ہیں دشمن بھی ہیں
ملحد ہوں میں ان کے لیے میری خطا دیوانگی
بانٹی گئیں جب نعمتیں عقل و ہنر کیا کیا نہ تھا
جب میری باری آئی تو میں نے کہا دیوانگی
اس شہر میں اک شخص تھا انجان سا ویران سا
مجھ سے بہت مانوس تھا ہے لاپتہ دیوانگی
کل شب مجھے اک شخص نے آئینے میں گھوراہت
پوچھا بتا تو کون ہے اس نے کہا دیوانگی
یہ دردوغم یہ شاعری، حیرتؔ اسی کی دین ہے
ممنون ہوں، مشکور ہوں، کیا کیا دیا دیوانگی

شمسیؔ قریشی
MOH:USMANPUR,POST,JALALPUR
DIST.AMBEDKAR NAGAR(U.P)

شگفتہ رو بھی نہیں، دل بھی تو کشادہ نہیں
اگر مزاج کی پوچھو تو وہ بھی سادہ نہیں
کتاب بھی ہے، ہیں آنکھیں بھی، بس ارادہ نہیں
نظر کے سامنے سب کچھ ہے استفادہ نہیں
کبھی عمل میں نہ آئے جو وہ ارادہ نہیں
جو ہو سکے نہ وفا وقت پر وہ وعدہ نہیں
اگر ہو چاند سی، خوشبوسی، روشنی جیسی
تو جس قدر بھی ملے زندگی زیادہ نہیں
ہنسو نہ مجھ پہ کہ جُڑنا نہیں بہت مشکل
میں لخت لخت ہُوا ہوں ابھی برادہ نہیں
یہ کیسے لوگ ہیں رہتے ہیں کس طرح آخر
کہ شاہرہ، سڑک کیا، کوئی بھی جادہ نہیں
ہمیں دکھائے جو شمسیؔ سراب کی صورت
ہمارے جسم میں ایسا کوئی لبادہ نہیں

گوہرؔ شیخ پوری
سائبان۔دولی گھاٹ پٹنہ سیٹی800008

بس اک بشر کے ملا اژدہا نشانے پر
رہی ہے ورنہ یہی فاختہ نشانے پر
چراغِ حق یوں ہی جلتا رہے گا محشر تک
ہزار کفر کی رکھّے ہَوا نشانے پر
تو اس نے لوٹ لیں پھر کیوں ردائیں بہنوں کی
اگر تھا جنگ میں میرا گلا نشانے پر
بچالو بڑھ کے تُم اردو زبان کو، ورنہ
ہے یہ غریب بھی اب باخُدا نشانے پر
نشانِ امن اُٹھاتو رہے ہو تم گوہرؔ
رکھیں نہ تم کو بھی اہلِ جفا نشانے پر

اوجؔ اکبرپوری
Akbar pur.Rohtas
82131(Bihar)

جو دل میں زخم تھا اس کو نمایاں کردیا ہم نے
تری چاہت میں چاک اپنا گریباں کردیا ہم نے
بجز تیرے کسی سے رابطہ باقی نہیں رکھا
خیالِ غیر کو بھی نذر زنداں کردیا ہم نے
اندھیرا چھایا تھا ظلم وستم کا ربع مسکوں پر
مساواتِ عدالت سے چراغاں کردیا ہم نے
اسی سے سر کٹانے کی تمنا جوش میں آئی
کیا ہے انقلابی رنگ کی پیدا زباں ہم نے
جنونِ شوق کی بھی لاج رکھنی تھی بہر صورت
"تم اترے دل میں جب دل کو بیاباں کردیا ہم نے"
سبق انسانیت کا اور تہذیب و تمدن کا
پڑھا کر اوجؔ انسانوں کو انساں کردیا ہم نے

نادرؔ اسلوبی
H.No:6-5-6,Hanamkunda
Warangal-506011(T.S)

گھونگھٹ میں جب تلک ترا چہرہ کھڑا رہا
ٹانکے بِنا مکان کا پردہ کھڑا رہا
دولت امیر کی ہے سلامت غریب سے
زردار سویا، خاک کا پُتلا کھڑا رہا
مانا کہ اُس کی ناز کی ہے دیدنی مگر
دس کے مقابلے میں وہ تنہا کھڑا رہا
یہ بات آج کس لیے پھر چھیڑتے ہیں آپ
جس بات کے سبب سے تھا جھگڑا کھڑا ہوا
کب کے وصول لیتا میں یہ قرض زندگی
تیرے اشارے پر مرا منشا کھڑا رہا
نادرؔ ستمگروں کے مکانات ڈَھ گئے
اک آپ کا مکان کھڑا تھا کھڑا رہا

مہدی پرتاپگڈھی

28-SchoolWard
Partapgadh-U.P)

کچھ حادثوں نے گاؤں کا منظر بدل دیا
لوگوں نے ہو کے خوفزدہ گھر بدل دیا
اس کے ہر ایک لفظ میں تیزابیت سی تھی
ہم نے بھی اعتماد کا دفتر بدل دیا
یہ تو سیاسی ذہنوں کا ادنیٰ سا ہے کمال
دستار جب بدل نہ سکے سر بدل دیا
بیساکھیوں سے قد کبھی ہوتا نہیں بلند
ہم نے عمل کا اس لیے دفتر بدل دیا
الفاظ کو نیے نیے ملبوس مل گئے
اذہانِ نو نے غزلوں کا پیکر بدل دیا
مہدی رہینِ عشرتِ ساحل نہ ہو وہ فرد
اس نے مزاجِ زعمِ سمندر بدل دیا

جاوید ندیم

103,QasbaPlaza.PatelMohlla
Panvel.NaviMumbai-410206

مختصر اپنی بزم آرائی
ہم ہیں، تیرا خیال، تنہائی
سچ کہ مفلس کی جیسے بیٹی ہو
دیدنی جھوٹ کی ہے رعنائی
اونچی مسند پہ سب گویئے ہیں
کون فن کی کرے پذیرائی
کب کسی کی ہوئی ہے یہ دنیا
یعنی دھوکہ ہے اس کی زیبائی
کوئی خط ہے کبھی نہ فون کوئی
یاد ان کو ہماری کب آئی
اور بھی خانما خراب ہوئے
تم ہی تنہا نہیں مرے بھائی

عبدالمجید فیضی

12/106,NayaPara.Sambalpur
Odisha-768001

زندگی اب مختصر سی رہ گئی
سانس بھی سینے میں اٹکی رہ گئی
کیا کریں اب اک قدم اٹھتا نہیں
منزل اپنی دو قدم ہی رہ گئی
میں کسی کے کام بھی نہ آ سکا
بس یہی اک خامی اپنی رہ گئی
اپنی اپنی سب کی ہے، سنتا بھی کون
ان کہی اپنی کہانی رہ گئی
دل میں صدہا آرزوؤں کا ہجوم
ہاں مگر بس تشنگی سی رہ گئی
میری مجبوری سمجھتا بھی کوئی
اک خلش سی دل میں باقی رہ گئی
فیضی کچھ تو دل کو گرماتی مرے
دب کے ہلچل دل میں کیسی رہ گئی

کرشن پرویز

Kharar.Dist;Mohali-140301
Punjab

ہر بات کو بھی رنگِ جدا دے گیا کوئی
ناراض ہو کے اور مزہ دے گیا کوئی
جرمِ وفا تو ہم نے کیا تھا مگر ہمیں
نامِ وفا پہ ہم کو دغا دے گیا کوئی
جو جا چکا ہے پیار کے بندھن کو توڑ کے
کیوں جاتے جاتے اپنا پتہ دے گیا کوئی
ہم کو ملا ہے آج محبت کا یہ صلہ
گھُٹ گھُٹ کے جینے کی یہ سزا دے گیا کوئی
پرویز بجھ نہ پائے گی یہ آگ عمر بھر
شعلوں کو دل کے اور ہوا دے گیا کوئی

چندر شیکھر عکس بھارتی

ChambaGhat.
Dist:Solan-173213(H.P)

مرغوب فقط ہم کو دلدار کی باتیں ہیں
اوروں کی جو باتیں ہیں بیکار کی باتیں ہیں
یہ بھی کوئی باتیں ہیں کرنے کی جو کرتے ہو
یہ سب غمِ دنیا کے اظہار کی باتیں ہیں
بھرپور ہے دل میرا انوارِ عقیدت سے
لب پر تری ہستی کے اقرار کی باتیں ہیں
وہ بات کرو جس سے کچھ فیض ملے سب کو
چھوڑو یہ سیاست کے افکار کی باتیں ہیں
اللہ کی عنایت سے حالات ہیں اب بہتر
اب دل سے بھلا دو جو ادوار کی باتیں ہیں
باتیں وہ کریں باہم کچھ ربط بڑھے جن سے
مت چھیڑیئے للہ جو تکرار کی باتیں ہیں

شارق عدیل

At/P.O:Marhera.Etah(U.P)
Mob-9368747886

خون سے پیہم مزین زندگی کا کرب ہوں
میں کہ اپنی خواہشوں کی روشنی کا کرب ہوں
خواب زادوں سے بھٹکنے سے بچانا ہے تجھے
اے شناسائے محبت آگہی کا کرب ہوں
خواہشیں بھی اب مرے اندر نہیں کرتیں قیام
شہرِ امکاں میں یہ کیسی بے گھری کا کرب ہوں
میں فنا کر کے بھی تم کو پا نہیں سکتا سکوں
اے اندھیرو انتہائے روشنی کا کرب ہوں
زندگی نے کر دیا ہے ایسی وسعت کا امیں
جو مجھے محسوس کر لے میں اسی کا کرب ہوں
مجھ کو شارق اس تضادِ زندگی پر فخر ہے
میں مسرت ہوں کسی کی اور کسی کا کرب ہوں

ڈاکٹر تبسم فرحانہ

RoadNo:7.NewKarimGanj
Gaya-823001(Bihar)

ہے محبت زندگی میں کچھ نہیں
پھول میں خوشبو، کلی میں کچھ نہیں
جوہرِ کردار ہی اک چیز ہے
یہ نہیں تو آدمی میں کچھ نہیں
قلب کو آسودہ ہونا چاہیے
ظاہری آسودگی میں کچھ نہیں
مرکزِ انوار کوئی اور ہے
چاند میں یا چاندنی میں کچھ نہیں
فصلِ گل آتی رہے جاتی رہے
فرق اب دیوانگی میں کچھ نہیں
ہے ضروری خونِ دل کی روشنی
ذہن کی جادو گری میں کچھ نہیں
جھوٹ کی شعلہ بیانی کے لیے
اے تبسم راستی میں کچھ نہیں

مظہر افتخاری

166/H/84,KeshabChandra
SenStreet.Kolkata-700009

سکون و امن کا ہر سمت انصرام ہوا
خوشی مناؤ کہ دورِ ستم تمام ہوا
بہت غرور تھا اس کو بھی اپنے سجدے پر
مقابل آئینہ رکھا تو لاکلام ہوا
عجیب تلخ نوائی کا وہ بھی پیکر تھا
زباں تھی میٹھی مری، اس لیے وہ رام ہوا
نظر ملا کے ذرا سر کو بس ہلا دینا
یزیدِ وقت کا سمجھو یہی سلام ہوا
زباں پہ آگ، نظر میں شرر جو رکھتا تھا
خلوص و مہر سے وہ بھی مرا غلام ہوا
سبھوں کے دل میں، نظر میں سمائے رہتا تھا
یہی سب ہے زمانے میں اس کا نام ہوا
ترے سخن کا جدا رنگ سب سے ہے مظہر
تری زمین، ترا قافیہ بھی عام ہوا

قدیر احمد قدیرؔ

NavedMnzil,Krishna
Colony,Hulkoti.52205
Dist:Gadak(Karnataka)

عزم ہے تو فاصلہ کچھ بھی نہیں
گر ہے ہمت راستہ کچھ بھی نہیں
اس سے بڑھ کر واقعہ کچھ بھی نہیں
کون ہوں مجھ کو پتہ کچھ بھی نہیں
کیا کہوں، کیسے کہوں، کس سے کہوں
سب ہیں میرے اور مرا کچھ بھی نہیں
تذکرہ محرومیوں کا کیا کروں
اب تو کہنے کو بچا کچھ بھی نہیں
ایک تنہا جان میری لاکھ غم
خیریت ہے مسئلہ کچھ بھی نہیں
پوچھتی ہے آہ پھر مظلوم کی
ظالموں کی کیا سزا کچھ بھی نہیں
کیوں نہیں جاتا یہ دردِ دل قدیرؔ
"دردِ دل کی کیا دوا کچھ بھی نہیں"

محبوب اکبر

1/7A/2,J.K.GhoshRoad
Belachia.Kolkata-700037
Mob:8981308944

فرش پر جیسے شکستہ بتِ پندار گرے
اس طرح رات کو سورج کے پرستار گرے
جس کو کشکولِ تمنا میں سجا رکھا تھا
وہ نگینے میری پلکوں سے کئی بار گرے
خود نمائی سے بچو یہ ہے خودی کی دشمن
جس کی تقلید سے انسان کا کردار گرے
باغباں ہی نہیں پنچھی کو بھی ہوتا ہے ملال
پیڑ جب کوئی گلستاں کا ثمردار گرے
بخش دیتا ہے گناہوں کو یقیناً اس کے
ہو کے شرمندہ جو سجدے میں گنہ گار گرے
دیکھ کر میرے تخیل کی بلندی اکثر
کچھ کبوتر گرے، شاہیں گرے، تعداد گرے
اس طرح گر پڑا محبوب میرے دل کا مکاں
جیسے آندھی میں کوئی ریت کی دیوار گرے

مشتاق افضل

F-14,ShahiAstabal
P.O:GardenReach
Kolkata-700024(W.B)

خوش فہم لوگ کرنے کو تذلیل آگئے
جو نرم دل تھے دار پہ تعجیل آگئے
جب ہم نے اپنی پیاس سے سمجھوتہ کرلیا
آنکھوں میں وہ سمیٹے ہوئے جھیل آگئے
معیار خستگی کا مری یوں ہوا بلند
لے کر حریر پوش بھی زنبیل آگئے
شرمندہ ہم سے ہوگیا طوفان کا غرور
روشن ہوا میں کر کے جو قندیل آگئے
تب ابرہہ کا ہوگیا ناکام عندیہ
جب سیکڑوں ہوا میں ابابیل آگئے
افضل خدا کا نام لیا تھا کہ دفعتاً
مفہوم لے کے فکر کے جبریل آگئے

افسر عثمانی

H.No:5-38,T.R.NagarColony
POst:Jagtial.Karimnagar-27

پا بہ زنجیری ہمیں عزمِ سفر دیتی ہے
جذبۂ فکر کو احساسِ دگر دیتی ہے
صبح دم ہو کہ سرِ شام بہر دیتی ہے
"زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے"
جبہ سائی نہیں معیارِ دلیلِ تقویٰ
بے نیازی غمِ دنیا پہ ظفر دیتی ہے
جب بھی دیتا ہے کوئی زخم یہ عیار جہاں
استقامت ہمیں انوارِ سحر دیتی ہے
دینے لینے کا یہ دستورِ جہاں اپنی جگہ
اس کی قدرت جسے جو چاہے ہنر دیتی ہے
دن میں دوبار صدا گونجتی رہتی ہے سنا
لحد انسان کو پیغامِ اُخر دیتی ہے
جب بھی دیتا ہوں مرے ذوقِ جنوں کو پرواز
فکر افسر مجھے آفاقی نظر دیتی ہے

ڈاکٹر رضی امروہوی

AbadMarket.Doodhpur.Aligarh
موبائل:9897601669

فہرست میں شہیدوں کی لو نام آگیا
سہرا بندھا کے بزم میں گلفام آگیا
سسرال میں ہے دھوم کہ داماد خوب ہے
یہ صبح تو گیا تھا سر شام آگیا
شادی سے پہلے ضعف کا احساس ہوگیا
آغاز بھی ہوا نہیں انجام آگیا
آساں نہیں ہے عشق کی منزل سنو میاں
اس امتحاں میں کتنوں پہ الزام آگیا
گوندھا ہے میں نے آرد خرما کو شہد سے
اور ہاتھ ان کے روغن بادام آگیا
کھائی ہے ریگ ماہی ملا کر جو کشتہ میں
ان کے دھڑکتے دل کو بھی آرام آگیا
معجون کا ہماری کرشمہ تو دیکھئے
ناکام کو بھی کرنا صحیح کام آگیا
جو منزلیں تھیں سخت وہ آسان ہوگئیں
نسخہ رضی کا وقت سفر کام آگیا

مظہر محی الدین

C/o. Ismail Panwale, 3rd Cross,
9-7-680, Near Mahanthaliya School,
B.T. Patil Nagar, KOPPAL-583231 (K.S)
Cell : 9448326670

ہر طرف کربلا نہیں ہے کیا
ایک اک پل کڑا نہیں ہے کیا
آدمی خود خدا نہیں ہے کیا
کفر کی انتہا نہیں ہے کیا
کثرت مال و زر کی حسرت نے
تجھ کو اندھا کیا نہیں ہے کیا
سستی شہرت کی چاہ میں تم نے
فن کا سودا کیا نہیں ہے کیا
ابر ہہ کیسے گل کے خاک ہوا
دشمنوں کو پتہ نہیں ہے کیا
کل کا جینا ہی اصل جینا ہے
یہ اہم فیصلہ نہیں ہے کیا
شعر گوئی کا تیرے اے مظہر
ہر طرف تذکرہ نہیں ہے کیا

قسیم سہرامی

ZiauddinDargah-Piro.Dt:Bhojpur(Bihar)
Mob-9122636792

کانپ اٹھا ہاتھ بھی ستمگر کا
مول جب کرلیا مرے سر کا
لطف لیتے ہیں خوب ہمسائے
آہ! اجڑے ہوئے مرے گھر کا
صرف میرا ہی گھر نہیں زد پر
مسئلہ ہے یہ آج گھر گھر کا
حق پرستوں پہ ظلم ہوتا ہے
حال دیکھا نہیں بہتّر کا
اپنی طاقت پہ تم نہ اتراؤ
کیا ہوا ابرہہ کے لشکر کا
حلق پہ تیر لب تھی مسکاں
کیا کلیجہ تھا ننھے اصغر کا
ہر کسی پہ ہے بے حسی طاری
آدمی ہوگیا ہے پتھر کا
دھندلا دھندلا سا ہوگیا ہے قسیم
وہ ستارہ مرے مقدر کا

محسن باعشن حسرت

4-PrincepStreet
1stFloor.Kolkata-72

مانا کہ تم گئے تھے نہ آنے کے واسطے
آجاؤ اب اے دوست نہ جانے کے واسطے
تم جب گرے تھے یاد ہیں اب تک ہمیں وہ دن
کتنے بڑھے تھے ہاتھ اٹھانے کے واسطے
میں ڈوب جب رہا تھا سمندر میں تو کوئی
آیا نہیں تھا مجھ کو بچانے کے واسطے
دل پر مرے ہے بوجھ غموں کا تو کیا ہوا
ہنسنا مجھے ہے سب کو ہنسانے کے واسطے
سب بن کے آنسو بہہ گیا آنکھوں سے خون دل
کچھ بچ گیا چراغ جلانے کے واسطے
حسرت سنا ہے آپ کے ہمدرد ہیں بہت
سچ مچ یا صرف سب کو دکھانے کے واسطے

حافظ کرناٹکی

P.BoxNo-6.Shikaripur
Shimoga-577427(karnatak)

کانٹے نکھرے سوکھے پھول
اب کے کھلے ہیں کیسے پھول
مانگے تھے کچھ میں نے جواب
اُس نے مجھ کو بھیجے پھول
کتنے اچھے لگتے ہیں
تتلی ، بھونرا ، بچے پھول
سویا تھا میں پیڑ تلے
مجھ پر دیکھو برسے پھول
صبح نو کی امامت میں
کرتے ہیں ہر دن سجدے پھول
حافظ کس کے آنے سے
رستہ رستہ مہکے پھول

شمیم یوسفی

Moh:QaziSarai.NearSaraiMasjid
At/P.O:Ara-802301(Bihar)
Mob:8986002183

دشمن جاں کی طرف سے بھی سلام آہی گیا
ہم کو جس کی آرزو تھی وہ پیام آہی گیا
بے حسی طاری ہوئی عقل وخرد پر جب کبھی
دل کی آنکھیں کھل گئیں گردش میں جام آہی گیا
مصلحت اندیشیاں روکیں بھی آخر کب تلک
وہ کمندیں ڈال کر بالائے بام آہی گیا
پردہ داری کی ہزاروں کوششوں کے باوجود
کشتگان شہر میں اپنا بھی نام آہی گیا
ہم نے سمجھا تھا کہ منزل ہے ابھی دوچار گام
چل پڑے تو راہ میں اکثر قیام آہی گیا
جس کی آزادی پہ نازاں ماہ و انجم تھے شمیم
سازشیں ایسی ہوئیں وہ زیر دام آہی گیا

افسانہ

حنیف سیّد
12\ 34,SUI KATRA, AGRA 282003 (U.P
Mob...No..09319529720

آنسو عقیدت کے

ڈیئر سرتاج...!

''اس وقت میری برات میرے گھر بیٹھی ہے۔میری سہیلیاں اور ہم جولیاں مجھ کو دُلھن بنانے کی تیاری میں ہیں.....اور.....میرے گورے گورے مہندی والے ہاتھوں میں زہر کی شیشی ہے۔اس کو تو رات ہی میں نے اپنے وجود کے گوشے میں اُتار لینا چاہا تھا،لیکن.. یہ سوچ کر باز رہی:''انسان کے سامنے بہت سی ایسی مجبوریاں آجاتی ہیں،جن سے وہ مجبور ہو جاتا ہے۔''ممکن ہے ایسی ہی کوئی مجبوری ہو تمھارے سامنے بھی....!لیکن سرتاج...!وہ مجبوری ہے کیا...؟بتا تو دو۔جس کے سبب اتنی بڑی سزا دی تم نے،مجھ کو۔''

''دیکھو سرتاج...!میں عورت ہونے کے ناتے تم سے وعدہ کرتی ہوں، کہ تم جو چاہو گے،ہوگا وہی۔میرے نزدیک تو اسی جذبے کا نام محبت ہے،جو اپنے محبوب کی رضا کے لیے ہو۔اور.....تم جانتے بھی ہو سرتاج....! کہ رفعت،اپنی جان دے سکتی ہے،پیار کے اس کھیل میں۔''

''میں پوچھتی ہوں:''کمی کیا تھی مجھ میں....؟''ذرا یاد کرو وہ حسین لمحات...!جب دیکھتے ہی دیوانہ وار اپنی مضبوط بانہوں کے حصار میں قید کر لیتے تھے، مجھ کو.....اگر تمھاری نظر میں مجھ سے زیادہ خوب صورت کوئی اور ہے،تو مجھ کو بھی پریوں کی شہزادی کہا تھا تم نے.....!''

''کیا تم نے مجھ کو اپنے پہلو میں بٹھا کر میری تعریفوں کے پُل نہیں باندھے تھے....؟یا کہ تمھارے اشاروں پر ناچی نہیں تھی میں...؟رہی خاندانی بندشوں کی بات.....!تو وہ بھی نہ تھیں،ہمارے اور تمھارے درمیان۔میرے ابّو کو یہ رشتہ پوری طرح پسند تھا....اور تمھاری امّی بھی مجھ کو اپنی بہو بنانے کے لیے دل و جان سے راضی تھیں۔پھر اِس محبت کے افسانے کو انجام دینے میں کوئی دشواری تو تھی نہیں،نہ تم کو، اور نہ ہی مجھ کو۔پھر میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ تم آخر مجھ کو ٹھکرا کیوں رہے ہو...؟''

''مجھ کو اچھی طرح یاد ہیں وہ دِن بھی...،جب میں راشد پر اپنی جان نثار کرتی تھی...اور خاص طور سے وہ دن بھی؛جب ابّو،رات کی ڈیوٹی میں فیکٹری گئے ہوئے تھے۔ اور میری چھوٹی بہن گلنار کو اچانک بخار نے آدبوچا تھا۔میرے مکان کے کرایے دار بھی اپنے گانو گئے ہوئے تھے اور میں اکیلی گھبرا رہی تھی،اسی لیے میں نے راشد کو اپنے گھر رات گزارنے کے لیے بلا لیا تھا۔راشد بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر میرے شباب کا قطرہ قطرہ نچوڑ لینے پر آمادہ تھا،اُس روز،لیکن تم اپنی بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے حالات کی نزاکت کو بھانپ کر میرے گھر آکر،ہم دونوں کے درمیان دیوار بن گئے تھے۔''

''خدا کی قسم سرتاج..!اُس رات تم بہت ہی برے لگے تھے،مجھ کو۔اُس رات میں نے تمھاری نظروں میں شرارت کو رقص کرتے پہلی بار دیکھا تھا۔میں اینٹ کے جواب میں پتھر اُٹھا سکتی تھی،لیکن راشد کے اشارے پر میں خاموش رہی تھی،بالکل خاموش۔راشد نے تم کو ایک جانب لے جا کر کچھ منوانے کی کوشش بھی کی تھی،لیکن تم ٹَس سے مَس نہ ہوئے تھے۔آخر اُس رات،راشد کو پیاسا ہی لوٹنا پڑا تھا، میرے گھر سے۔پھر تو تم جب تب چھیڑنے لگے تھے،مجھ کو۔''

''پہلے تو تمھاری شرارتیں کانٹے کی طرح کھٹکیں مجھ کو؛لیکن پھر دیوار کے سہارے چڑھنے والی بیل کی طرح مجبور ہو گئی،میں بھی،اور جب تب تمھارے بالائی کمرے کی جانب پہلے نظر اٹھنے لگی،میری۔اور پھر قدم بھی اُٹھنے کے لیے مجبور ہو گئے۔پھر تو نہ جانے کتنی حسین گھڑیاں تمھاری آغوش میں گزار دیں،میں نے۔تم بھی اپنے کشادہ سینے سے لگا کر اتنے بوسے دیتے تھے کہ میں پاگل ہو جاتی تھی۔پیار کے جام ہم دونوں کے ہونٹوں پر چھلکتے رہے؛لیکن ہم دونوں کی تشنگی برقرار رہی۔''

''سرتاج.....!کیا تم کو وہ دِن یاد نہیں...؟جب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا،جس کا اظہار میرے بھڑکتے ہوئے جذبات اور مخمور نگاہوں کے چھلکتے پیمانوں نے کر دیا تھا۔اور میرے تشنہ جذبات نے سماجی بندھنوں کی زنجیروں کو پامال کر دینا چاہا تھا؛جس کی جھنکار سے کانپ گئے تھے تم..اور تم نے سماجی بندھنوں کو یہ کہہ کر مضبوط کر لیا تھا:''رفّو.!یہ سب شادی سے پیشتر گناہ ہے،بہت ہی بڑا گناہ...!''

''تمھاری یہ بے وقت کی نصیحت کس قدر ناگوار گزری تھی،مجھ کو۔لیکن میں تم سے بے پناہ پیار کرتی تھی۔تمھارے اشارے پر تا حیات کنواری رہ سکتی ہوں۔چاہو تو آزما لو،اب بھی...!تمھاری چاہت سے انکار بھی کب کیا،میں نے...؟ لیکن آج صرف اتنا بتا دو مجھ کو۔کہ مجھ کو نہ اپنانے میں کیا مجبوریاں رہیں،تمھاری...؟''

''جب بھی کسی لڑکے سے میرے رشتے کی بات چلی،ابّو نے تمھاری وجہ سے اُس کو صاف انکار کر دیا،کیوں کہ اُن کے ذہن میں میرے لیے تم ہی سب

سے زیادہ مناسب تھے ۔میں نے اپنے لیے آئے ہر رشتے کے بارے میں بتایا،تفصیل سے سمجھا سمجھا کر،تم کو۔لیکن تم،ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہر بات کی حد ہوتی ہے،آخر۔ بہ ہرحال میرے ابّو بھی کب تک انتظار کرتے،تمھارا...؟ آخر کو مجبوراًانھوں نے ایک رشتہ منظور کر کے،بات پکی کی اور فوراًتاریخ دے دی۔اس خبر سے جب میں نے تم کو آگاہ کیا،تو تم نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا: ''رفّو..!تم میری ہو،اور میری ہی رہوگی ۔تم کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔'' تمھاری بات پر نہ جانے کیوں اب تک یقین ہے،مجھ کو۔کیوں کہ تم نے مجھ کو راشد سے خود بڑی جدو جہد کر کے چھینا تھا۔پھر بھلا اِس دنیا میں کون چھین سکتا ہے تم سے مجھ کو.....؟''

''لیکن سرتاج...!اس روز تم کو کھڑکی میں کھڑا دیکھ کر میری ایک سہیلی نے تمھارے بارے میں مجھ کو جو کچھ بتایا،پر یقین نہیں آیا،مجھ کو۔کیوں کہ تم نے میرے لاکھ چاہنے کے باوجود میرے دامن میں کوئی داغ نہ لگایا،پھر تم دوسری معصوم لڑکیوں کی زندگیوں سے بھلا کیوں کر کھیلے ہوگے...؟''

''نہیں.....نہیں....تم ہرگز ایسے نہیں ہوسکتے،یقیناًمیری سہیلی جھوٹ بولی،یا پھر اُس کو زبردست غلط فہمی ہوئی،تمھاری طرف سے۔تم ایسے نہیں ہوسکتے،کبھی بھی نہیں ہوسکتے،تم ایسے،کبھی بھی نہیں۔پھر بھی نہ جانے کیوں میرے ذہن کے ناہموار جنگل میں خوف ناک درندے چیخ رہے ہیں،زہریلے اژدہے،بچھو اور کنکھجورے کلبلا رہے ہیں،چاروں طرف سے خاردار جنگلی جھاڑیوں میں الجھی ہوئی ہوں میں، پوری طرح۔جس سے تم ہی نکال سکتے ہو،مجھ کو۔لیکن سرتاج....!میں اپنے ہاتھوں میں رچی منہدی کو نظرانداز نہیں کرسکتی اس وقت۔کروں بھی تو کیسے...؟ گھر آئی ہوئی برات کو جھٹلایا بھی تو جاسکتا۔میرا مائیوں میں بیٹھنا،میری سہیلیوں کا بار بار میرے کمرے میں آ آکر مجھ کو چھیڑنا اور پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہونا....!یہ سب خواب تو نہیں.....!حالاں کہ اس حقیقت کو جھٹلانے کے لیے اپنے سر کو کئی بار دیوار سے ٹکرا چکی ہوں،میں۔لیکن کوئی خواب ہو تو ٹوٹے بھی،ہاں...!ایسے خواب تو میں نے بار بار دیکھے ہیں کہ میں تمھاری دُلھن بنائی جارہی ہوں،اور تم دُولھا بنے میرے سامنے کھڑے ہو۔''

''مگر سرتاج!خواب تو بہ ہرحال خواب ہی ہوتے ہیں اور حقیقت،حقیقت۔وہ خواب تھے،جو ٹوٹ گئے اور یہ حقیقت ہے،جس نے میرے سر میں گومڑے ڈال دِیے ہیں۔بھلا کیسے نظرانداز کردوں،ان گومڑوں کو،جن کے درد سے میرا سر پھٹا جارہا ہے۔''

''کیا یہ حقیقت نہ تھی کہ تم نے دو روز پہلے کی رات میرے رونے اور گڑگڑانے پر ترس کھا کر،کل کی رات جو گزر گئی،میرے ساتھ نکل کر کہیں دور ایک نئی دنیا،پیار کی دنیا، بسانے کا وعدہ نہیں کیا تھا،تم نے....؟اور .....!جب میں تمھارے وعدے پر بھروسا کر کے،پچاس ہزار روپے اپنے بریف کیس میں رکھ کر تمھارے کمرے پر پہنچی،تو بہت ہی سخت مایوسی ہوئی،مجھ کو...! کیوں کہ تم نے اپنے کمرے کا دروازہ نہ کھولا۔جب کہ اپنے کمرے میں موجود تھے،تم...!میں تم کو آواز دیتے دیتے تھک گئی۔لیکن تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ٹیبل فین چلنے کی آواز،اور کمرے کے اندر جلتی ہوئی ٹیوب کی روشنی،تمھارے وہاں موجود ہونے کا ثبوت تھے۔''

''سرتاج.....! کہہ دو کہ تم اپنے کمرے میں نہیں تھے...!لیکن تم تھے اپنے کمرے میں۔یہ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ تم اپنے کمرے میں موجود تھے ،اُس وقت۔کیوں کہ تمھارے چھینکنے کی آواز پہچان لی تھی میں نے،اچھی طرح۔لیکن سرتاج...!تم تو مجھ کو بے حد چاہتے ہو،نا....؟تم ہرگز نہیں کرسکتے،ایسا....!''

''کہہ دو سرتاج کہ تم اُس وقت اپنے کمرے میں نہیں تھے۔میں تمھاری جھوٹی بات کا اعتبار کر کے جھٹلالوں گی،خود کو۔یا پھر یہ کہہ دو کہ تم کو اچانک کوئی مجبوری لاحق ہوگئی تھی۔اچھے اچھے جھک جاتے ہیں،مجبوریوں کے آگے۔لیکن سرتاج...!تم جھک سکتے ہو کسی مجبوری کے آگے.....!میں نہیں۔میری محبت کے آگے کسی بھی مجبوری کی کوئی بساط نہیں۔یہ زہر کی شیشی میری ساری مجبوریوں کو فنا کردے گی،ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔اور میں سدا کے لیے چلی آؤں گی،تمھارے پاس۔یہ فانی جسم نہ ہوا تو کیا...؟لافانی رُوح تو تم تک پہنچ کر میرے اِس دعوے کو ثابت کردے گی کہ ایسی کوئی بھی مجبوری نہیں ہوسکتی پیار کے راستے میں،کبھی بھی نہیں۔''

''سرتاج...!اگر تم نے اب بھی مجھ کو نہ اپنایا،تو یہ زہر حلق میں اتارلوں گی پوری طرح،اور یہ رُوح تم سے جا ملے گی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔پھر دنیا کی کوئی طاقت جدا نہ کرسکے گی،ہم دونوں کو۔''

صرف تمھاری

رفّو.........!

''پیاری رفّو......!تمھارا خط پڑھ کر تمھاری نادانی پر بے اختیار ہنسی آئی مجھ کو،بے اختیار....!''

''تمھاری سہیلی نے تم سے بالکل ٹھیک کہا میرے بارے میں،کہ تم جیسی بھولی بھالی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو میں نے اپنے فریب کا نشانہ بنایا ہے،اس میں غلط فہمی کی تو کوئی بات ہی نہیں۔رفّو..!میں ہر اُس بھولی بھالی معصوم لڑکی سے اپنے پیار کا ڈھونگ رچاتا ہوں،جس کے دامنِ عِفّت کو سماج کے آوارہ کُتّے،جُھوٹے پیار کا جال ڈال کر تار تار کردینا چاہتے ہیں۔''

''رفّو.....!یقین کرو...!اُس رات راشد بھی تم کو ایک نوخیز کلی کی مانند اپنی ہوس کا شکار بنا کر تمھاری زندگی کے خرمن میں انگارے بھر دینا چاہتا تھا اور تم اُس تباہی کو محض اپنی نادانی کے سبب دعوت بھی دے رہی تھیں۔جس کو میری نگاہوں نے محض چند منٹوں میں پرکھ لیا تھا۔اسی لیے میں اپنا والہانہ پیار لے کر تمھاری جانب صرف اِسی جذبے کے تحت بڑھا تھا کہ تم میرے پیار کے گورکھ دھندے میں الجھ کر وقتی

(بقیہ صفحہ 50 پر)

ضیا جعفر بنگلور
194-5HCross J.H.B.C Layout
J.P.NAGAR POST,Bngalure-560078
(Karnataka)

افسانہ

صابرہ خاموشی سے اپنے شوہر کی لاش کو تکے جارہی تھی۔ پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔ بظاہر اس کے چہرے پر غم کے تاثرات بھی نہیں دکھائی دیے۔ اس کے شوہر عتیق کو انتقال ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا۔ رشتہ دار اور جانے پہچانے لوگوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ باہر سینکڑوں کی تعداد میں سوگوار موجود تھے۔ ہر کسی کی آنکھیں نم تھیں۔ کوئی زور سے آہ و بکا کر رہا تھا' کوئی خاموش غم کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ ہر ایک کے چہرے پر غم نمایاں تھا۔

کسی نے بتایا'' کتنے نیک اور رحم دل انسان تھے' وقت ضرورت ہر ایک کی مدد کر دیا کرتے تھے' مگر اس نیک دل شخصیت کی بیوی عتیق کے تعلق سے غلط فہمیوں کا شکار تھی۔ احساس برتری اس کی رگ رگ میں سمائی تھی۔ ہمیشہ انھیں برا بھلا کہا اور ان کے دلی جذبات کو کچلتی رہی۔ انھیں زک پہنچاتی رہی' مگر بے چارے نے کبھی اُف تک نہیں کی۔ خاموشی سے اپنی بیوی کے ہر وار کو سہتے رہے اور کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل جاتے'' اللہ انھیں نیک توفیق دے''۔ گھریلو پریشانی سے بچ نکلنے کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ انھوں نے اپنی ایک پرانی خواہش کی دبی چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ پھر ضروری بحث سے بچنے کے لیے انھوں نے ادبی رسائل اور کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ویسے بھی ان کا شوق پرانا ہی تھا۔ جلد ہی وہ عتیق الرحمٰن کے قلمی نام سے افسانے' مضامین اور مراسلے لکھنے شروع کر دیے۔ اپنی انفرادی تحریر کی وجہ سے جلد ہی انھیں ایک اونچا مقام مل گیا۔ وہ ریاستی حدود کو توڑ کر ملکی سطح پر جا پہنچے۔ خوب نام کمایا اور اعزازات اور انعامات بھی خوب حاصل کیے۔ اسی سبب سے ان کا تعلق کئی ادبی اداروں سے بھی رہا۔ لیکن اونچے عہدے کبھی قبول نہیں کیے۔

صابرہ بڑے گھرانے کی بیٹی تھی۔ جہاں اس نے اپنی مرضی کا جینا جیا۔ اپنی ہر خواہش کو پورا کیا۔ ذہین بھی تھی اس لیے گریجویشن کرنا کوئی مشکل کام نہ رہا۔ اس نے اپنے مستقبل کے تعلق سے ہوائی قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ تاہم ایک شائستہ گھر کی لڑکی کا رشتہ جب ایک شکستہ سے گھر کے نوجوان سے طے ہو گیا تو اس کے ہوائی قلعے ریت کے محل ثابت ہوئے۔ لیکن والد کی مرضی کے آگے اس کی ایک نہیں چلی۔ اس کے والد نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ اقدام اٹھایا تھا۔ ورنہ کون اپنی اکلوتی بیٹی کا برا چاہتا ہے؟ اس کے والد کے انتقال کے بعد وصیت کے تحت جائداد کا بڑا حصہ اور ایک معقول رقم اس کے حصے میں آئی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ عتیق ایک اونچے عہدہ پر فائز تھے۔ لیکن بڑی سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ ورنہ اونچے عہدے پر پہنچ کر ایک شکستہ گھر میں کون رہتا؟ شادی کے بعد صابرہ نے ایک اسکول ٹیچر کی ملازمت قبول کر لی۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ شوہر نے اعتراض نہیں کیا۔ اس لیے بھی کہ اس کے مکان میں صابرہ تنہا سارا سارا دن کب تک گزارتی؟

اپنی تیز زبانی کی وجہ سے وہ پڑوسیوں میں بھی غیر مقبول تھی۔ عتیق نے سوچا کہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر اکتا جانے سے تو بہتر ہے کہ من کہیں لگا رہے۔ انھیں پتا تھا کہ بیکار دماغ شیطان کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ شادی کے بعد وقت گزاری کے لیے انھوں نے صابرہ کو اس کی اجازت دے دی۔ عتیق نے بینک میں ایک جوائنٹ اکاؤنٹ کھول دیا۔ وہ بھی تنخواہ اسی اکاؤنٹ میں جمع کرنے لگے۔ پاس بک ہمیشہ صابرہ کے پاس رہتی۔ انھوں نے کبھی پاس بک نہیں دیکھی کہ ان کے اکاؤنٹ میں کتنے روپے جمع ہیں اور صابرہ کتنے روپے نکالتی ہے۔ انھوں نے گھر کے تمام خرچ کی ذمہ داری صابرہ پر چھوڑ رکھی تھی۔ ان کا کام صرف روپے جمع کرنا تھا۔ عتیق نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ اس کی تنخواہ کتنی ہے اور وہ اس کا کیا کر رہی ہے۔ اتنا ضرور تھا کہ صابرہ نے اپنے اسکول میں کبھی عتیق کی برائی کسی سے نہیں کی۔ احساس کمتری کا شکار صابرہ کیوں اپنی ہنسی کا سامان اپنے کولیگز Collegagues میں خود مہیا کرتی؟ کون اپنے گھر کے حالات دوسروں کے سامنے رکھ کر رسوائی برداشت کرے؟ عتیق کی اپنی جائداد اور زمینیں تھیں جن کی آمدنی وہ غرباء اور حاجت مندوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ وہ اپنی نیکی کی تشہیر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے فلاحی کاموں اور خیر خواہی کی بھنک بھی صابرہ کو لگنے نہیں دی کہ شاید ان کے ہاتھوں پر روک لگا دے۔ البتہ انھوں نے اپنی اولاد کو ہم نوا بنا لیا تھا۔ جو ان کی ہر کاروائی میں ساتھ دیتے ہوئے ہمت بڑھاتے تھے۔

لیکن جب عتیق کو پتہ چلا کہ صابرہ میں صبر نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور وہ اس شکستہ گھر میں گھٹن محسوس کر رہی ہے تو انھوں نے جیسے تیسے مکان کو تڑوا کر نیا مکان تعمیر کروا دیا تا کہ صابرہ کو ہرگز گھٹن محسوس نہ ہو۔ ماں باپ کی لاڈلی بیٹی عزت کے ساتھ زندگی گزارے۔ ان کا منشا تھا کہ صابرہ کسی بھی صورت خوش رہے۔ شادی کے بعد ایک بیٹی اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹا انجنیئر تھا اور دوسرا ڈاکٹر تھا۔ بیٹی نے بی ایڈ کر لیا

تھا۔انجنیر بیٹے اور بیٹی کو ملازمت مل گئی تھی۔ڈاکٹر بیٹے نے اپنی ذاتی کلنک کھول رکھی تھی۔زندگی بڑی آسودگی کے ساتھ گزر رہی تھی۔اپنی سروس ہی میں انھوں نے بیٹی کی شادی اپنے ہم خیال دوست کے ملازمت پیشہ بیٹے کے ساتھ نہایت سادگی کے ساتھ کر دی۔بیٹوں کی شادی کے لیے کچھ مہلت مانگی ورنہ عتیق اس ذمہ داری سے سر دھو لیتے۔

مگر صابرہ کی الجھی ہوئی شخصیت نے انھیں اندر ہی اندر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ان کے کسی بھی کام سے مطمئن نہیں تھی۔ ہر کام میں نیخ کنی اس کا محبوب مشغلہ بن کر رہ گیا تھا۔ اسے عتیق کا سر نیچے کرنے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ بچے اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔وہ انھیں راہ راست پر لانے کی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔اپنی امی کی آنکھیں کھولنے کی کوشش میں ان کی آنکھیں بھر جاتی تھیں۔اسی لیے وہ باپ سے بے حد قریب ہو گئے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں اچھی خاصی پنشن ملنے لگی تھی۔اب ان کا زیادہ وقت دین کے اور فلاحی کاموں میں صرف ہونے لگا۔تا ہم انھوں نے اپنا محبوب مشغلہ آج بھی برقرار رکھا۔کئی افسانوں پر انھیں انعامات اور اعزازات ملے تھے۔تاہم ہونی کو کس نے روکا ہے۔ایک صبح وہ اپنے بستر پر مردہ پائے گئے۔ کسی سے خدمت نہیں لی۔کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ان کی خواہش بھی یہی تھی کہ کسی کو تکلیف پہنچائے بغیر راہِ عدم سدھاریں۔خدا نے ان کی سن لی۔گھر میں کہرام مچ گیا۔بیٹی اور داماد جن کا مکان قریب ہی تھا آگیے۔ بیٹے سر پٹخ پٹخ کر رونے لگے تھے۔لیکن صابرہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تک دیکھی نہیں گئی۔وہ ایک سکتے کے عالم میں پلکیں جھپکائے بغیر اپنے شوہر کو گھورے جا رہی تھی جیسے ان کا اس طرح اچانک گزر جانے سے شاک لگا ہو۔شاید وہ انھیں اور ستانا نہیں چاہتی تھی۔چند ہمدردوں نے ان کے انتقال کی خبر کے پوسٹر چھپوا کر شہر بھر کے اہم مقامات اور گلی کوچوں میں لگوا دیے۔فراخ دلی اور نیک نامی کی وجہ سے ان کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کے طرح پھیل گئی۔گلی میں جیسے ٹھاٹیں مارتا ہوا انسانی سمندر موجزن تھا۔سب کے چہرے اداس تھے۔آنکھیں پُرنم تھیں،عورتیں صابرہ اور ان کی بیٹی کو صبر کی تلقین کرتیں اور مرد ان کے بیٹوں سے ہمدردی جتاتے۔

مگر سب کو ایک ہی فکر لاحق تھی کہ صابرہ کیوں نہیں رو رہی ہے۔کیا اسے شوہر کے بچھڑنے کا غم نہیں؟ بیٹی اور کئی عورتوں نے زور سے بین بھی کیا کہ وہ رو پڑے، ڈاکٹر بیٹے نے خاص طور پر صابرہ کو رلانے کی ہدایت دے رکھی تھی۔ مستقبل میں ہسٹریا کے دورے بھی پڑ سکتے ہیں۔دماغ کی رگیں پھٹ کر برین ہیمرتج بھی ہو سکتا ہے۔لیکن سب کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔وہ ایک ٹک اپنے شوہر کو پلک جھپکائے بغیر گھور رہی تھی۔دفعتاً ایک شریر بچے نے آنکھ بچا کر ان کا شوکیش کھولا جس میں صابرہ کے نواسوں کے کھلونے رکھے ہوئے تھے۔اس نے جیسے ہی کھلونوں کی جانب ہاتھ بڑھایا تو زوردار آواز کے ساتھ ایک مومنٹو نیچے گر پڑا جسے عتیق نے ایک بہترین افسانہ لکھنے پر حاصل کیا تھا۔

صابرہ چونک پڑی۔کسی نے بچے کو ڈانٹا اور ٹوٹے ہوئے مومنٹو کو درست کرنے کی کوشش کرنے لگے۔جیسے ہی صابرہ کی نظر اس ٹوٹے ہوئے مومنٹو پر پڑی اس نے لپک کر اسے چھین لیا اور اپنے سینے سے لگا کر بے اختیار رونے لگی، جیسے اس کے سینے سے مومنٹو نہیں لگا ہو بلکہ اپنے شوہر لگ گیے ہوں۔روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔وہ ہچکیوں کے درمیان سوچنے لگی کہ اس نے مرحوم کو زندگی بھر خوشی نہیں دی، کتنے الزامات لگایے، طعنے کسے، بد کلامی کی، لیکن مرحوم ہمیشہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہویے کہا کرتے تھے "خدا تمھیں نیک توفیق دے"

"اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں میرے سرتاج" صابرہ نے روتے ہویے بتایا "میں نے تمھیں پہچاننے میں دیر کر دی۔تم نیکی کے فرشتہ کا ایک روپ تھے، ہمیشہ لوگوں کا بھلا کیا، لیکن میں ہمیشہ تمھیں دکھ پہنچاتی رہی، زک پہنچاتی رہی، ذلیل کرتی رہی، خدارا مجھے معاف کر دیجئے، خدارا مجھے معاف کر دیجئے"۔وہ ان کے قدموں پر بے ہوش ہو کر اس طرح گری کہ پھر اٹھنے کا موقع نصیب نہ ہو سکا۔☆☆☆

(آنسو عقیدت کے)

طور سے راشد کو نظر انداز کر دو،اور تمھاری معصومیت پر جال پھینکنے کا موقع نہ مل سکے اُس کو،شادی سے پیشتر۔" مجھ کو اپنا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کچھ دشواریاں تو آئیں،لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا،بہ ہر حال۔راشد کے فریبی پیار کو نظر انداز کر کے میری الفت کے گورکھ دھندے میں الجھ گئیں پوری طرح،تم۔"

"رفّو...!اپنے اُسی والہانہ پیار کے ذریعے میں تم کو اِس مقام تک لانے میں پوری طرح کامیاب ہو گیا۔یقین جانو،رفّو...!میں نے تم سے کوئی فریب نہیں کیا بلکہ تمھاری اصل منزل تک پہنچا دیا ہے،صاف ستھرا؛تم کو،جس کی کہ متمنّی تھیں،تم۔ یعنی کہ میں نے جو راشد سماجی بھیڑیے کے روپ میں تم سے چھینا تھا،وہی آج اپنی کوششوں سے تمہارے شوہر کے روپ میں تم کو لوٹا رہا ہوں،جو اِس وقت تمھارے دروازے پر سہرا باندھے،تمھارے دُولھا کے روپ میں،بڑی عقیدت کے ساتھ تمھارے پیار کی بھیک مانگنے آیا ہے۔رفّو...!یہ کل کا وہی فریبی راشد؛آج کا وفا پرست تمھارا شریکِ حیات بننے کا متمنّی ہے۔آج اُس کے پاس فریب کا وہ جال نہیں،جو تمھاری معصومیت کا گلا گھونٹ سکے۔"

"کل کا فریبی راشد،جو سماج کے سامنے تم کو رسوا کرنے پر آمادہ تھا،آج اُس کا وہی پیار سماج کو تمھارے پیار کے قدموں پر جھکانے لایا ہے،خود کو۔"

"میرے اِس منصوبے کو ممکن ہے تم فریب اور دھوکے کا نام دو،لیکن میرے نزدیک یہ ایک عبادت ہے۔اسی عبادت کے ذریعے میں بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو سماج کی بخشی ہوئی،اُس سیج تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں،جہاں اُن کو سچا پیار،سماجی وقار اور حقیقی زندگی سے فیضیاب ہونے کے مواقع میسّر آتے ہیں۔"

"اِس عبادت کے ذریعے میں نے تم کو بھی تمھاری اُس منزل تک پہنچا دیا ہے،جس کے لیے تم اُس رات بہت بے قرار تھیں۔"

"رفّو...!مجھ کو پوری اُمید ہے کہ میرے پیار کے فلسفے کو اچھی طرح سے سمجھ لیا ہوگا تم نے۔اور اب تم نے خوشی خوشی راشد کی ہو جانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہوگا،پوری طرح۔اگر نہیں...!تو پھر میرے ہاتھ میں بھی زہر کی شیشی ہے۔"

تمھارا راہ بر سرتاج.........☆☆☆☆

افسانہ

دوسو روپے

ملیالی کہانی
افسانہ نگار۔تھا کا جی شیوشنکر پلاّئی
مترجم۔عبدالمتین جامؔی
موبائل۔9938905926

(اے رسالہ ملیالم ناول نگار اور افسانہ نگار ''تھا کا جی'' کو ادب کے سب سے بڑے اعزاز ''گیان پیٹھ'' سے نوازا گیا تھا۔۱۹۶۱ء میں ان کے ناول چمپین سے ان کو بین الاقوامی شہرت ملی اس کو ساہیتہ اکاڈمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ بہت سی غیر ملکی زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے۔تھا کا جی نے تقریباً ۳۵ رناول اور پانچ سو افسانے لکھے ہیں۔زیرِ نظر افسانہ ''دوسو روپے'' معرکتہ الآرا افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے۔جس کو اردو قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جارہا ہے)

جب گوبند پلاّئی کی عمر ساٹھ سال کی ہوگئی تو اس کو ٹریزری آفس سے ریٹائرمنٹ اور پنشن کا حکم نامہ مل گیا۔ٹریزری آفس میں اس کا کام تھا ریز گاریوں کو بستوں سے نکال کر میزان میں رکھ کر وزن کرنا پھر ان ریز گاریوں کو چودہ تھاکوں میں سجا کر رکھ دینا۔ان تھاکوں میں سے ہر ایک تھاک کی قیمت کیا ہوتی تھی کتنے پیسے ہوتے تھے اتنے دنوں سے کام کرتے کرتے اس کو اتنا تجربہ ہوگیا تھا کہ بستے کے اندر ہاتھ بھر کر اندازاً اتنا ہی پیسہ از خود نکال لاتا تھا جتنے کی ضرورت ہوتی تھی۔پینتیس برسوں سے روزانہ گیارہ بجے سے پانچ بجے تک تانبے کے سکوں کا دھندا کرتے کرتے اس کا چہرہ بھی تانبے کی طرح کا ہو چکا تھا۔ زندگی بھر اس نے کوئی کروڑ روپے کے سکّوں کو اس طرح سے وزن کیا ہوگا۔اپنے دفتر سے پائے گئے زرد کوٹ کو زیب تن کر کے وہ اپنے دفتر کو روز آیا کرتا تھا۔اپنے کوٹ کے نیچے اس کو شرٹ پہننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔اس کے کوٹ کے بٹن تو ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ نیا بٹن لگانے کے لئے اس کے پاس فرصت نہیں تھی۔سیفٹی پن لگا کر کام چلا لیتا تھا۔وہ ٹریزری کے تیرہ و تاریک کمرے کے اندر سکّوں کو وزن کرتا رہتا تھا۔وہ دفتر کی ایک ایسی جگہ بیٹھتا تھا جہاں سے وہ کسی کو دیکھ سکتا تھا اور نہ کوئی اسے دیکھ سکتا تھا۔اس کی پینتیس سالہ ملازمت کے دوران اس دفتر میں بہت سی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔کتنے نئے چہرے آئے اور گئے لیکن پیسے کوڑی کے لین دین میں کئی لوگ بدلے مگر پلاّئی نہیں بدلا اور نہ اس کی جگہ بدلی۔دفتر کے ایک کونے میں وہ ریز گاریاں وزن کرتا رہا۔نہ تو دفتر کا کوئی آدمی اس سے بات کرتا تھا اور نہ ہی دنیا میں اس سے بات کرنے والا کوئی آدمی تھا۔دفتر میں ہر وقت شور مچا رہتا، سکّوں کی ٹھنٹھناہٹ سنائی دیتی رہتی۔اس وقت دفتر میں کام کرنے والے لوگ اپنے کاموں میں لگے رہتے۔کوئی اس کی طرف مُڑ کر کیوں دیکھتا۔پانچ بجتے ہی سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے۔

اس روز گوبند پلاّئی ہر روز کی طرح دفتر کی طرف چل پڑا۔پاجا کے قریب اور برتج کی طرف سے چھوٹی سی گلی مغرب کی سمت جاتی ہے۔اس راستے سے نصف کوس کا راستہ ہے۔اس کے بائیں سمت ایک خستہ حالت میں ایک پھوس کا مکان ہے۔اس مکان کے چھوٹے سے کمرے میں ایک طرف لکڑی کے تختے پر لکھا ہوا ہے ''شیاء ہوٹل''۔گوبند پلاّئی یہیں رہتا ہے۔پلاّئی کے علاوہ اور بھی پانچ آدمی مستقل طور پر اس ہوٹل میں رہتے تھے۔چار پولیس کے کانسٹبل اور ایک شخص محکمۂ آب کاری کا ملازم۔مگر ان لوگوں کے ساتھ جان پہچان نہیں ہو پائی کیونکہ گوبند نے ان لوگوں کے ساتھ تعلقات استوار نہیں کئے تھے۔پلاّئی دن بھر میں مشکل سے دو چار بات کرتا تھا۔ہوٹل کی دیکھ بھال کرنے والی لکشمی اماں کے کھانے چنتے وقت اگر بہت ضرورت پڑتی تو پلاّئی کی زبان سے نکل پڑتا تھا ایک گلاس پانی یا اور ذرا کھانا۔ بس اتنی سی باتیں اس لکشمی کے علاوہ اور کسی کے ساتھ نہیں کرتا تھا۔اس کا نام گوبند پلاّئی تھا اور یہ نام اس کو کس نے دیا' اس کا گھر کہاں ہے' اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔لکشمی اماں بولتی ہے کہ آج گوبند پلاّئی بیس سال پہلے بھی ویسا ہی تھا۔اس کے پاس نہ کبھی کسی کا خط آتا اور نہ ہی وہ کسی کے پاس خط بھیجتا تھا۔ہر معمول کے مطابق بستر سے اٹھتا' کھاپی کر وہی پُرانا پھٹا کوٹ پہن کر روز کی طرح دفتر چلا جاتا۔ملازمت کے چالیس سالوں کے درمیان اس کی طبیعت کبھی خراب نہیں ہوئی۔اس لئے وہ اس دوران دفتر میں کبھی غیر حاظر نہیں رہا۔ اس روز بھی وہ دفتر کو چل دیا۔

ٹریزری کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے پیر رک گئے۔لوگ اندر جارہے تھے اور پھر باہر آرہے تھے۔گوبند نے اندر دیکھا پچھلے چالیس سالوں سے جہاں بیٹھ کر وہ سکّوں کو وزن کرتا رہا تھا آج ایک لڑکا سکّے وزن کر رہا تھا۔پلاّئی وہیں برآمدے میں بیٹھ کر ستون سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔وہ بھول گیا تھا کہ ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔

کچھ دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔کسی پاگل کی طرح وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا تیز بھنت پورم کی گلی کی طرف چل پڑا۔پہلے وہ اس گلی کی طرف کبھی نہیں آیا تھا۔شیوسیام ہوٹل سے دفتر اور دفتر سے ہوٹل ہوتے ہوئے اس کی زندگی گزر گئی تھی۔وہ ایک چوک پر پہنچا۔بجلی کی روشنی سے وہ جگہ روشن ہوگئی تھی۔چاروں طرف وہ گھوم گھوم کر دیکھنے لگا۔لوگ اس کے پاس سے جلدی جلدی چلے جارہے تھے۔کاریں بور کر دینے والی آواز دیتی ہوئی گزرتی جارہی تھیں۔رات کے دس بجے بھی یہ لوگ کہاں جارہے ہیں؟ان لوگوں کے لئے کون انتظار کر رہا ہوگا۔گوبند پلاّئی سوچ رہا تھا۔بارہ بج گئے ہر طرف سناٹا ہوگیا۔گوبند کھلے آسمان کے نیچے راستے پر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

اچانک بارش ہوگئی۔ گوبند بارش میں بھیگ گیا۔ لیکن بارش کی ہر بوند سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کھلی ہوئی دنیا کو اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔ گوبند ہوٹل کے پاس آ گیا۔ ہوٹل بند ہو گیا تھا۔ اس کے لئے اتنی رات گئے کون انتظار کرے گا۔ لکشمی اماں کو بلائے گا کیا؟ کیا حق ہے اس کو بلانے کا؟ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔

رات بھر بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے بخار آ گیا۔ وہ اپنے کمرے کے اندر چارپائی پر لیٹا رہا۔ کبھی کبھی بے ہوشی بھی طاری ہو جاتی۔ ایک روز لکشمی اماں نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر آواز دی۔ انا اس کھانے سے ایک مٹھی کھا لو۔ وہ لکشمی اماں کی طرف کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ ''میں مر جاؤں گا'' اپنی آنکھوں میں بلا کا درد بھر کر اس نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کس کو اس کے لئے غم ہوگا؟ وہ جب مر جائے گا اس کی روح کے سکون کے لئے کون دو قطرے آنسو بہائے گا۔

گوبند پلاّئی کی متاعِ حیات اگر کچھ تھی تو بس پُرانا ٹرنک۔ وہ ٹرنک اس کے کوٹ کی طرح پُرانا تھا۔ ساٹھ سال سے اس کے اندر پس انداز کیا ہوا دو سو روپے تھا۔ جس کو اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کیا تھا۔ دو سو روپے کسے دے گا؟ کون پائے گا وہ روپے۔ کون ہوگا حق دار؟ وہی انجان حق دار شاید اس کے لئے روئے گا۔ اسی دو سو روپے کے عوض اس کے لئے شاید آنسو بہائے گا۔

اس روز کھاتے وقت پولیس والے نے لکشمی اماں سے دریافت کیا' یہ شخص مر جائے گا لکشمی اماں۔ اس کو لے کر کسی خیراتی اسپتال میں ڈال آؤ ورنہ آگے چل کر اس کے لئے تو پریشانی میں پھنس جائے گی۔

لکشمی اماں نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے نے پوچھا' کیا حقیقتاً کوئی نہیں ہے؟

کیا پتہ؟ میں تو جب سے ہوٹل چلا رہی ہوں تب سے وہ اس ہوٹل میں ہے۔ لکشمی اماں نے جواب دیا۔ بے چارہ!

اس روز کھانے کے برتن کو لے کر لکشمی اماں اس کے کمرے میں گئی تو پلاّئی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ مجھے اسپتال بھیج دو ورنہ میں یہیں مر جاؤں گا۔ لکشمی اماں کے اندر کی نرم دلی کو گوبند کے الفاظ چھو گئے۔

اس نے پوچھا' انا۔ کیا تمھارا کوئی نہیں ہے؟۔ اسے کریدنے کی نیت سے گوبند نے اماں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ہاں! ہے' جو ابھی میرے سرہانے بیٹھ کر رو رہی تھی۔ وہی۔

کون؟ کہاں انا؟ میں تو کسی کو دیکھ نہیں رہی ہوں۔ لکشمی اماں نے حیرت سے کہا۔

گوبند کچھ دیر خاموش رہ کر بولا حقیقتاً تم لوگ مجھ کو اسپتال بھیج دو گے؟

نہیں انا نہیں۔ تم یہاں بیس سالوں سے ہو۔ تم کو میں اسپتال نہیں بھجوں گی۔

اس طرح بخار میں تپتے ہوئے پلاّئی نے لکشمی اماں سے پوچھا! میرے مر جانے سے تم روؤ گی کیا؟

کیوں مرنے جینے کی بات کرتے ہو تم؟ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ گوبند پلاّئی کے اندر سے ایک لمبی سانس خود بخود نکل گئی۔

گوبند پلاّئی کی طبیعت سنبھل گئی مگر ایک ہی بات اس کے دل میں بیٹھ گئی کہ وہ ایک دن مر جائے گا۔ اس کے دو سو روپے کا کوئی حق دار نہیں ہے۔ وہ مر جانے سے اس کے لئے آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

ایک روز صبح اٹھنے کے بعد اپنا پرانا کوٹ پہن کر باہر نکل پڑا۔ کبھی کبھی تو وہ اس ہوٹل کو بالکل ہی نہیں آیا۔ اس کی دنیا ابھی وسیع سے وسیع تر ہونے لگی تھی۔ لکشمی نے پوچھا انا کہاں گئے تھے۔

وہ چُپ رہا۔ ایک مرتبہ چار روز بعد ہوٹل لوٹا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ اس روز کھانا دیتے وقت لکشمی اماں نے پوچھا۔ انا تم نے شراب کیوں پی؟ کبھی تو پیتے نہیں تھے۔ پلاّئی ہڑبڑا گیا۔ اس نے اماں کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھا۔ یکا یک اس کے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر گنگنانے لگا۔ لا رے۔ لپّا۔ لا۔ تھوڑی دیر بعد کہا میرا کوئی نہیں ہے میں اکیلا ہوں۔

اوہ۔ لکشمی اماں نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ پلاّئی نے بڑی سختی سے اس کے ہاتھ کو پکڑ رکھا تھا۔ نشہ کے عالم میں وہ بول رہا تھا۔ بیس سالوں سے.... جب میں مر جاؤں گا۔

لکشمی نے سوچا پلاّئی نشے میں مدہوش ہو چکا ہے۔

....تم میری بیوی ہو....

لکشمی اماں ہنس پڑی اور اس کی ہنسی سے پلاّئی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ ایک کرسی پر کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ اتنی دنوں بعد اس کو احساس ہوا کہ اتنے دنوں سے ٹریزری آفس میں ملازمت کرنے والا گوبند پلاّئی فقط ایک مشین نہیں تھا۔ اس کا منہ لوہے سے بنا ہوا نہیں ہے۔ اس کے بھی جذبات ہیں۔ چھوٹی سی چھوٹی بات سے بھی اس کے چہرے کا تاثر بدل سکتا ہے۔ اس کی زبان سے پیار و محبت کے الفاظ نکل سکتے ہیں۔ اس کے جسم میں بھی خون ہے' گوشت ہے اور اس کو بھی ایک روز مرنا ہے۔ زندہ لاش کی مانند وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر باہر چلا آیا۔ پاس والے گھر سے لکشمی اماں کے ہنسنے کی آواز ویسے ہی سنائی دے رہی تھی۔ گوبند پلاّئی ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

چار روز بعد جب گھر لوٹا تو پولیس والا کھانے بیٹھا تھا' لکشمی اماں اس کے قریب بیٹھی ہوئی اور بڑے پیار سے اس کو کھانا کھلا رہی تھی۔

گوبند پلاّئی نے دیکھا کہ اس کو دیکھتے ہی پولیس والا اور لکشمی اماں جان بوجھ کر ہنسنے لگے۔ وہ راستے پر دوڑ کر بھاگ آیا۔ وہ دونوں اور بھی زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

زندگی بھر کی کمائی میں سے کاٹ کاٹ کر وہ دو سو روپے اس نے اس عورت کے لئے جمع کیا تھا جو اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے آنسو بہائے گی۔ مگر اچانک وہی سکّے پگھلنے لگے تھے۔ اب وہ تین چار دنوں میں گھر آنے لگا تھا۔ ایسا ہی کئی ماہ تک ہوتا رہا۔

اس درمیان لکشمی اماں کا ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ تقریباً دو ہفتے باہر گھومنے کے بعد گوبند پلاّئی گھر لوٹ آیا۔ اس پولیس والے نے گوبند سے پوچھا

(بقیہ صفحہ 54 پر)

افسانہ

ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری
ریتھ پور، ضلع امراؤتی ۔۴۴۴۷۰۴ (مہاراشٹر)
موبائل۔9403860486

کیسے اور کیوں؟؟ (ابتدائی خیال مُستعار لیا گیا ہے)

چار تعلیم یافتہ افراد ایک کشتی میں سوار ہوکر دریا عبور کررہے تھے۔ملاح اپنی پہاڑی آواز میں ایک سمندری گیت الاپ رہا تھا۔ساتھ ہی چپّو چلاتا جارہا تھا۔اس گیت کی لے پر اس کی کشتی آگے بڑھ رہی تھی اور اس کی مشقت کا احساس کم کررہی تھی۔ان چاروں میں سے ایک نے سوال کیا...؟

''کیا تم نے تعلیم حاصل کی ہے.....؟'' ملاح کا جواب تھا نہیں..... بالکل نہیں.....بچپن ہی سے باپ کے ساتھ کشتی میں سوار مسافروں کو دریا کے اِس پار سے اُس پار اور اُس پار سے اِس پار اتارتا رہا ہوں۔اس لئے تعلیم حاصل نہیں کرسکا۔

ارے تم نے تو اپنی آدھی زندگی ضائع کردی.....

پھر تم اتنا خوبصورت گیت کیسے گاتے ہو......؟

دوسرے نے سوال کیا....

یہ گیت تو ہم سبھی ملاح کو اپنے باپ داداؤں سے سن کر ہی یاد ہو جاتا ہے۔اسے سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی.....

تمھیں اس کے علاوہ بھی اور کچھ آتا ہے.....؟

''ہاں....چپو چلانا..... گیت گانا' ہوا کا رُخ پہچاننا' موسم کے حالات کو سمجھنا' طوفان اور مصیبت کے وقت حواس کو قابو میں رکھ کر پوری ہمت اور پامردی سے مقابلہ کرنا۔ کشتی میں سوار مسافروں کے جان و مال کی حفاظت کرنا....کیا مچھلی کے بچے کو تیرنا سکھایا جاتا ہے؟ ارے یہ بھی کوئی بات ہوئی....!؟

تیسرے نے کہا۔

ہمیں دیکھو......! یہ ڈاکٹر ہیں.... میں وکیل ہوں..... یہ انجینئر ہیں.... یہ ادیب ہیں۔ ہم نے برسوں مدرسوں کالجوں میں تعلیم حاصل کی ہیں....تب آج یہ سب علم و ہنر سیکھ پائے ہیں۔اپنی زندگی کو کامیاب بنا پائے ہیں اور تم نے تو آدھی زندگی برباد کردی۔

اسی وقت آسمان میں کالے کالے گھنے بادل گھر آئے' تیز ہوائیں چلنے لگیں....دریا میں زبردست اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں۔موٹی موٹی بوندوں کا مینھ شروع ہوگیا۔تیز ہوا اور اونچی لہروں کے تھپیڑوں سے کشتی ڈولنے لگی.....دریا میں طوفان آگیا....ملاح اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کر کے کشتی کو کھیتا رہا۔ کیونکہ مسافروں کے جان و مال کی حفاظت اس کا فرض تھا۔اور وہ اپنا فرض خوب جانتا تھا۔

اخیر میں جب طوفان کا زور بہت بڑھ گیا' ملاح کے لئے کشتی کو کھینا مشکل ہوگیا تو اس نے مسافر سے کہا....کیا آپ لوگوں کو تیرنا آتا ہے....؟

چاروں نے ایک ساتھ جواب دیا.... ''نہیں ہمیں تیرنا نہیں آتا''۔

تب تو آپ نے اپنی پوری زندگی برباد کردی....کیونکہ کشتی میں بوجھ زیادہ ہوگیا ہے' کشتی ڈوبنے کے قریب ہے' مجھے تیرنا آتا ہے میں تو تیر کر کنارے پہنچ جاؤں گا اور ساتھ صرف ایک شخص کو اپنے ساتھ کنارے تک لے جاسکوں گا۔اب آپ بتائیے....کہ! میں کس کو اپنے ساتھ کنارے تک لے جاؤں.....اور.....کیوں......؟

میں وکیل ہوں پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمات کو میں اپنی علمی لیاقت اور مدلّل جرح کے ذریعہ سلجھا کر فیصلے اور انصاف کو اپنے موکل کے حق میں کھینچ لاتا ہوں۔ کتنے ہی ملزموں کو جیل جانے' بھاری جرمانہ ادا کرنے حتیٰ کہ پھانسی کے پھندے سے چھڑا لایا ہوں۔....اس لئے مجھے بچایا جائے' میں زندگی میں کبھی تمھارے بھی کام آسکتا ہوں۔

ملاح نے وکیل صاحب کی باتوں کو پورے صبر وسکون سے سنا اور پھر کہنے لگا:۔وکیل صاحب میں ایک سیدھا سادہ ملاح' مجھے کورٹ کچہری اور عدالت سے کیا کام.....؟ میں نے کبھی قانون نہیں توڑا' کسی کا حق نہیں چھینا۔نمبر دو کا کوئی کام نہیں کیا۔کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا۔مار پیٹ تو کیا گالی بھی نہیں دی۔ہمیشہ قانون کا احترام کیا....اور آئندہ بھی انھیں اصولوں کے مطابق زندگی گزاروں گا اس لئے آئندہ بھی مجھے آپ کی کسی امداد کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

اب ڈاکٹر صاحب آگے بڑھ کر کہنے لگے....: میں ڈاکٹر ہوں! مشکل سے مشکل امراض اور بیماریوں کا علاج جانتا ہوں' بڑے بڑے آپریشن کر چکا ہوں' کئی مریضوں کی جانیں بچا چکا ہوں' معمولی سردی بخار سے لے کر مشکل آپریشن تک میں علاج کرتا ہوں....شاید کل تمھیں میری ضرورت محسوس ہو' اس لئے مجھے بچایا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر ملاح ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگیا پھر کہنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب، ہم دریاؤں کو اپنے زورِ بازو سے عبور کرنے والے چپو چلانے کی سخت جسمانی محنت کرنے والے' کسی بھی موسم میں اپنے کاموں کو انجام دینے والے صاف کھلی ہوا میں سانس لے کر جینے والے' ہمیں سردی بخار تو چھو بھی نہیں سکتا اور عیش و آرام میں زندگی گزارنے والے عیش پسند لوگوں کی بیماریاں تو ہمارے قریب

بھی نہیں پھٹکتیں اور بڑے بڑے آپریشن کروانے کے لئے ہمارے پاس دولت بھی کہاں ہے، ہم تو فطری زندگی جیتے ہیں اور فطری موت مر جاتے ہیں۔آئندہ زندگی میں مجھے آپ کی ضرورت شاید ہی محسوس ہو۔

اب انجینئر صاحب نے اپنی لن ترانی شروع کی۔دنیا کی خوبصورتی میرے دم سے ہے۔تاریخی عمارتیں بڑے بڑے پل، ڈیم، کارخانے، خوبصورت بلڈنگیں یہ سب میری علمی قابلیت سے بنائے گئے ہیں۔آرام دہ مکانات، باغات، عالیشان ہوٹلیں، ہوائی اڈے، پلیٹ فارم، بندرگاہیں وغیرہ کی تعمیر میں میرا بڑا حصہ ہے....اس لئے مجھے زندہ رکھنا ضروری ہے۔

ملاح نے انجینئر صاحب کی بات بھی سنجیدگی سے سنی اور پھر کہنے لگا۔

ہاں یہ سب سچ ہے، مگر دریا کے کنارے ناریل کے تنوں اور پتوں سے اپنی جھونپڑی بنانے والے ملاح کو ان تعمیرات سے کیا غرض.....؟ یہ تو پہلے کبھی راجہ مہاراجاؤں کے کھیل تھے۔اور اب لوٹی ہوئی دو نمبر کے دھندوں سے کمائی ہوئی کالی دولت کے دولت مندوں کا مشغلہ ہے، مجھے آپ سے کوئی کام ہوگا....مجھے تو نہیں لگتا۔ہماری نسلیں انھیں جھونپڑ پٹی کی جھونپڑیوں میں پیدا ہوتیں، پلتیں، جوان ہوتیں پھر بوڑھی ہو کر مر جاتی ہیں....کوئی بھی تو ان عمارتوں اور تعمیرات کے خواب نہیں دیکھتا....شاید میں بھی نہیں.....اس لئے.....

اخیر میں ادیب (قلم کار) نے نہایت انکساری مگر اتنی ہی خود اعتمادی سے اپنی اہمیت بیان کرنا شروع کیا۔

میں ادیب (قلم کار) ہوں۔میں ادب کی زمین میں خیالات کے ہل چلا کر لفظوں کے بیج بوتا ہوں تا کہ ہر دور میں ادب کی زمین پر نئی نئی فصلیں لہلہاتی رہیں۔اور یہ سرسبز و شاداب زمین سبھی کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنی رہے۔دنیا کے تمام علوم کا ادب بھی میں ہی تخلیق کرتا ہوں۔میرا علم زندگی کے ہر شعبۂ حیات پر محیط ہے۔وکیلوں کو نئے نئے رجحانات اور نظریات دیتا ہوں۔ڈاکٹروں کو نئے نئے انکشافات سے ان کے کاموں میں آسانیاں پیدا کرتا ہوں۔انجینئروں کو نئے نئے خیالات سے نوازتا ہوں۔اگر میں نہ رہوں تو علم کے یہ سارے سوتے خشک ہو جائیں گے، علم کا سمندر سوکھ جائے گا۔کوئی نیا نظریہ، نیا انکشاف، نیا خیال جنم نہیں لے سکے گا۔اور ادب کی یہ زمین بانجھ ہو جائے گی۔

ملاحوں کی تھکن دور کرنے اور ان کی مشقت و محنت کی تھکن کے احساس کو کم کرنے کے لئے جوشیلے گیت لکھوں گا۔معصوم بچوں کے لئے توتلی زبان میں بولوں گا۔ملاحوں کے مسائل اور ان کی پریشانیوں کو عوام اور حکومت تک پہنچا دوں گا۔ان کو حل کرنے کے لئے جدوجہد کروں گا۔عوام کی خوشی، خوش حالی اور انصاف کے لئے سینہ سپر رہوں گا۔فوجی گیت، قومی ترانے، کسانوں اور مزدوروں کے لئے ان کی زبان میں نغمے لکھوں گا۔نئی نسلوں کے لئے ادب تخلیق کروں گا۔اور اگر میں نہیں رہا...تو یہ سب کون کرے گا؟ اس لئے میرا زندہ رہنا ضروری ہے، مجھے بچایا جائے۔

خدا نے اپنے کلام پاک میں جس قلم کے ذریعہ علم سکھانے کا ذکر کیا ہے، ایسا علم جو انسان نہیں جانتا تھا...اس قلم کا وارث بھی تو میں ہی ہوں قلم کار......اس لئے.....قلم کار کی باتیں ختم ہونے تک طوفانی موج کے ایک تھپیڑے نے کشتی کے سارے تختے بکھیر دیئے۔

ملاح ایک لمحہ کی دیر کئے بغیر قلم کار کو ایک تختے پر لٹا کر ایک ہاتھ سے تیرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے وہ تختہ کنارے کی طرف دھکیلنے لگا۔

☆☆☆

(دوسو روپے کا بقیہ)

کیا لکشمی اماں راضی ہوئی؟

پلّائی خاموش رہا۔لکشمی اماں نے اس پولیس والے سے دس سال قبل ہی شادی کر لی تھی۔لیکن بیس سالوں سے اس ہوٹل میں رہتے ہوئے بھی گوبند کو اس کی خبر نہیں ہوئی تھی۔اس روز وہ دن بھر شراب پیتا رہا۔جس روز اس کو ریٹائرمنٹ کا حکم نامہ ملا اس کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی۔مگر آج وہ خود کو جوان محسوس کر رہا تھا۔

ایک روز شام کو وہ ہوٹل آیا اور سال ہا سال سے جمع کردہ دوسو روپے کے سکوں کو دیکھنے کی غرض سے ٹرنک کھولا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹرنک کے اندر ایک بھی سکہ نہیں تھا۔اس روز کے بعد سے گوبند پلّائی کو کسی نے نہیں دیکھا۔☆☆☆

ایس۔کیو۔عالم۔طلعت
KASHANA
PumpHouseRoad,Torwa.Bilaspur(C.G)

افسانہ

قربانی

اسلم اور ششی کانت چوتھی جماعت سے کلاس فیلو رہے۔میٹرک دونوں نے ۱۹۵۶ء میں پاس کیا۔دونوں کا ارادہ ہوا کالج کی پڑھائی کہیں دوسرے شہر میں کی جائے۔ششی کے فادر تو تیار ہو گئے لیکن اسلم کے والد اس کے لئے تیار نہیں تھے۔پھر ششی کے فادر کی ہی رائے سے تیار ہو گئے کیونکہ ششی کے دو ماموں الہ آباد ہی میں رہتے تھے جوان کو گارجین شپ دیں گے۔الہ آباد میں داخلہ کے لئے بہت پریشانی ہوئی۔بڑی دوڑ بھاگ کے بعد ماریہ کرسچین کالج (M.C.C) میں داخلہ ملا۔شہر سے دوری تھی اس لئے ہاسٹل کا سہارا لینا پڑا۔الفینا ہاسٹل میں ان دونوں کو جگہ ملی۔کالج میں مخلوط تعلیم کا انتظام تھا۔ڈسپلن کے باعث لوگ اکثر اپنی لڑکیوں کا داخلہ یہیں کرانا پسند کرتے تھے۔

الفینا ہاسٹل کے انچارج شرما جی تھے۔اسلم فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا اس لئے جلد ہی لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔اسلم اکثر غزل گاتا رہتا تھا جسے شرما جی بھی بڑے شوق سے سنتے تھے۔دوسرے ہی سال Annual function میں جب بھجن competion رکھا گیا تو شرما جی نے اسلم کو بھی حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔اُس سال فلم بیجو باورا ریلیز ہوئی تھی۔اسلم نے اسی فلم کے بھجن ''من تڑپت ہے ہری درشن کو آج'' کی تیاری کی اور competion پہلے نمبر سے جیت لیا۔فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ سپنا دوسرے نمبر پر آئی۔

پھر جنوری میں سرسوتی پوجا کا تہوار آ گیا۔یوپی بہار میں سرسوتی پوجا اسکول کالج میں ہی ہوتی ہے۔شرما جی نے سرسوتی وندنا کے لئے اسلم کا نام پیش کیا جس کی منظوری پرنسپل نے بھی دے دی۔یہ بات سپنا کو اچھی نہیں لگی۔اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ اسلم اس میں حصہ نہ لے مگر کامیاب نہیں ہو سکی تو براہِ راست اسلم سے ہی اپنا نام واپس لینے کو کہا۔اسلم تذبذب میں پڑ گیا۔شرما جی اسے اتنا مانتے تھے کہ وہ ان کی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔وہ افسردہ تھا' تب ہی ششی نے اسے ایک ترکیب بتائی جس پر عمل کرتے ہوئے اسلم رات میں ایک پیاز بغل میں دبا کر سو گیا۔کچھ دیر بعد وہ بخار میں تپنے لگا۔صبح جب سو کر نہیں اُٹھا تو شرما جی اٹھانے آ گئے۔وہ بے سدھ پڑا تھا' شرما جی نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ایسے میں نہانا اور وندنا گانا ممکن نہیں تھا۔مایوس ہو کر سپنا کا نام ہی طے پایا۔وہ بہت خوش تھی کہ بھگوان نے اُس کی پرارتھنا قبول کر لی۔اس کی زیادہ خوشی ششی سے برداشت نہیں ہوئی اور ساری حقیقت اس پر کھول دی۔جس سے سپنا بہت غم زدہ ہو گئی اور پہلی فرصت میں اسلم سے مل کر جہاں اس کا شکریہ ادا کیا وہیں اس کی یہ قربانی نے اُسے اسلم کا دوست بنا دیا۔سپنا کے فادر جو ایس پی تھے اسلم کو گھر بلا کر اُسے اس بات کے لئے شکریہ ادا کیا اور گھر پر آتے رہنے کو کہا۔سپنا کا بھائی ستیش اسلم کے ساتھ ہی پڑھتا تھا اور فٹ بال کی وجہ سے دونوں اچھے دوست بھی تھے۔

وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار دوڑ رہا تھا۔ادھر اسلم اور سپنا کی دوستی نے پیار کا رنگ اختیار کر لیا۔وہ بے انتہا ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چُھپتا۔خبر ایس پی صاحب کے کانوں تک بھی گئی۔پہلے انھوں نے اپنی لڑکی کو سمجھایا پھر اسلم سے اس پیار کو آگے بڑھنے سے روکنے کو کہا۔اپنے گھر اُس کا آنا جانا بھی بند کرا دیا۔لیکن اُن کے پیار میں کمی نہیں آئی۔دونوں کو اس نے سامنے بٹھا کر بھی بات کی لیکن کوئی نتیجہ خاطر خواہ سامنے نہیں آیا تو آخر مجبور ہو کر انھوں نے چپکے سے اسلم کے والد کو ٹیلیگرام دے کر بلایا۔اُن کا آدمی اسٹیشن سے اسلم کے والد کو گھر لے آیا۔پھر اسلم کو خبر دے کر گھر بلایا۔اسلم اپنے والد کو وہاں دیکھ کر سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔یہ ایس پی صاحب کا آخری حربہ تھا۔بات سب کے سامنے رکھی گئی۔ایس پی صاحب نے اسلم کو T.C لے کر واپس جانے کی بات کہی۔سمجھانے کے ساتھ اپنے پیشے کے انداز میں دھمکی بھرے جملے بھی کہے۔اسلم اور سپنا کو اپنی دنیا تاریک ہوتی نظر آئی۔معاً دونوں اُٹھے اور اجازت لے کر اندر روم میں چلے گئے جہاں دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر بہت دیر تک روتے رہے اور دونوں نے ایک فیصلہ کیا۔ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہال میں آئے جسے دیکھ کر سب چونک گئے پھر دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم لوگ اس پیار کے سلسلے کو ختم کر دیں گے اور ساتھ ہی قربانی دیں گے۔آج کے بعد ہم کتاب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے' مطلب یہ کہ ہم اپنی تعلیم یہیں ختم کرتے ہیں تا کہ اس قربانی کو یاد کر کے ہم سدا اپنے دلوں میں اس پاک پیار کو زندہ رکھ سکیں۔

دونوں نے آنسو بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔اسلم اپنے والد کو لے کر ایس پی صاحب کے بنگلہ سے نکل گیا۔سپنا دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

اقبال سلیم
No.97,Aiwan-e-Tahera.4thMain,8thCross
J.H.B.C.S.Layout..J.P.NagarPost
Bangalore-560078

افسانہ

دِلوں کے داغ چھپاؤ

تار پڑھ کر ابا جان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا' میں پھینک کر دوڑی، کیا ہوا ابا جان......؟

وہ تار میری طرف بڑھا کر بولے، ہوتا کیا میرا سر......لوتم خود پڑھ لو۔

تار پڑھ کر میں خود بھی سن ہو کر رہ گئی، سلمان بھائی کا تار تھا، ہم لوگ آج رات کی گاڑی میں سے پہنچ رہے ہیں۔

وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا، خدا تمھاری ماں کو جزائے خیر دے، مگر تم لوگ ایک طوفان کا سامنا کرنے کو ضرور تیار ہو جاؤ۔

انھوں نے گردن موڑ کر امی کی طرف دیکھا جو کچھ فاصلے پر نماز سے فارغ ہو کر آنکھیں بند کیے دعا میں مصروف تھیں، وہ ان کے قریب جا کر بولے، سنتی ہو بیگم! بنگلور سے تار آیا ہے۔ دونوں صبح کے بھولے آج شام کو گھر پہنچ رہے ہیں۔

امی کی پیشانی پر بل پڑ گئے، کون دونوں.....؟

وہی پسر نوح سلمان اور اس کی دلہن اور کون.....!

امی بھونچکی رہ گئیں اور آمین بھول کر چٹ پٹے کی کی لکڑیاں کی طرح پھٹ پڑیں، چھری بھونک دیں گی پیٹ میں۔ اگر یہاں کسی نے قدم رکھا۔ میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔

گزر جائے گا۔ ابا جان بات کاٹ کر چیلنج کے انداز میں بولے۔ یہ پل صراط تو ہے نہیں۔ وہ خود بھی ماشاءاللہ ہٹا کٹا ہے اور پھر پولس میں انسپکٹر ہے۔

انسپکٹر ہوگا اپنی جورو کے ہاں کا۔ یہاں دال نہیں گلے گی۔ ایسے پولس والے میری جوتی کے نوک پر رہتے ہیں۔

بہو کو ہراساں کرنے کے الزام میں حوالات میں پھنکوا دیے گا۔ معلوم!

معلوم ہے! اتنا قانون تو ہم بھی جانتے ہیں، دیکھو کیسے پھنکواتا ہے، ویسے ہی کیا سب کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں، کیا دیکھ نہیں رہے ہیں دو سال سے دُم دبائے چھپتا نہیں پھر رہا ہے، کیا کبھی گھر میں گھسنے کی ہمت کی ہے؟

مگر سنوں تو سہی، میرا کیا ہے؟ آج مرا کل دوسرا دن۔ پھر کس کے در پر پڑی رہوگی۔ یہ بھی تو سوچو۔ اللہ سلامت رکھے، ابھی میرے ممیرے خلیرے زندہ ہیں، وہ کسی کے در کے بھکاری نہیں ہیں، سر پر بٹھائیں گے۔ وہاں نہیں تو محلے والوں کے کپڑے لتے سی کر جی لوں گی۔

یعنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤ گی۔ ابا جان مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا۔ یہ بھی تو سوچو لوگ کیا کہیں گے۔ سگے بیٹے سے سوتیلے کا سلوک ہو۔

مجھے لوگوں سے کیا لینا دینا ہے، چاند کی طرف تھوک کر وہ خود ہی شرمائیں گے، پھر وہ بیٹا کیا جو خاندان کی نیا ڈبو کر نہ شرمائے۔ دیوانی ہوتی ہو۔ ابا جان ایک لمحے کے لئے سٹپٹا گئے پھر جھنجھلا کر بولے۔ بیٹا اپنا ہی خون ہوتا ہے، سات آسمان ادھر سات سمندر ادھر جی بیٹا، بیٹا ہی ہوتا ہے۔ کیا اسے نو ماہ اپنی کوکھ میں نہیں رکھا تھا۔ برسوں اپنا خون پلا پلا کر نہیں پالا ہے، مگر تم تو اس طرح خار کھائے بیٹھی ہو جیسے وہ تمھارا زمین میں گاڑ رکھا خزانہ لے بھاگا ہو تم نہ سہی ہر کوئی اپنی پسند خوشی اور آرزو کی تکمیل کے لئے آزاد، اور سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جاتا ہے، اور پھر جوانی۔ وہ ایک لمحے کے لئے رُکے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے، جوانی اندھی ہوتی ہے بیگم۔ اور تم جہاں دیدہ ہوتے ہوئے ہی بھی اپنی ضد اور جھوٹے وقار کے دباؤ پر اپنے اس مست سانڈ کو شادی روک دی تھی اور وہ فرہاد زدہ، اپنی دُھن کا پکا اس شادی پر بضد تھا۔ تم اس جیالے کی ہمت کی داد دو۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اگر تم سمجھتی ہو کہ اس نے تمھارے وقار کی مٹی پلید کی ہے تو یہ تمھاری سراسر زیادتی ہے، ویسے لڑکی کوئی بھنگن یا چمار نہیں ہے۔ اپنے سگے بھائی کی بیٹی ہے اور صورت و شکل کی ماشاءاللہ......!

ابا جان نے رُک کر میری طرف دیکھا اور انگلی سے اپنی پیشانی ٹھونک کر بولے، بھلا اسے کیا کہتے ہیں سلمیٰ۔

میں نے اپنی ہنسی روک کر ڈرتے ڈرتے اماں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور چپکے سے جواب دیا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ ہوگی میری جوتی آفتاب مہتاب۔ جھاڑو پھرے ایسی چڑیل پر۔ میرے بیٹے کو لے گئی۔ اور بیٹے صاحب کو کیا اسی دن کے لئے نو ماہ اپنی کوکھ میں رکھا تھا۔ کیا اسی دن کے لئے برسوں تک اپنی چھاتی کا دودھ پلا کر پالا تھا کہ ایک کلے چرا چوکھٹا دیکھ پھسل جائے اور اپنی نصیبوں جلی ماں کو گدھے کی طرح لات مار کر اس کے پیچھے دم دبائے نکل جائے۔

یہ کہہ کر جلدی جلدی تسبیح کے دانے ڈھلکانے لگیں۔

بیگم! ابا جان ان پر جیسے ترس کھا کر بولے۔وہ یہاں کچھ لینے نہیں وہ اپنی دودھ پلائی ماں کو دیکھنے آرہا ہے۔اور تم ایک بے بس عورت۔آ کر تم اپنا غصہ کس پر اُتاروگی بقول شخصے ''اسے کیا کہتے ہیں سلمٰی!

قہر درویش بر جانِ درویش، میں نے ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے جواب دیا۔

ہاں قہر درویش بر جانِ درویش۔ابا جان خوش ہوکر بولے اور امی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔تو میں خود بھی بجھے دل سے اپنے کمرے میں چلی آئی اور ایک کتاب اٹھالی، مگر دل نہ لگا۔کتاب جیسے ماضی کا البم بن گئی تھی اور الفاظ تصویریں، کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے کارواں سے چلے آرہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ یادوں کے کارواں ہوں، میرے ذہن کی بظاہر خاموش خلاؤں میں یادوں کی بارات کی شہنائی سی بجنے لگی۔مجھے وہ دن یاد آرہے تھے جب کئی سال پہلے امی جان کی ان کے اکلوتے بھائی جمیل ماموں کی نانا جان کی جائیداد کے سلسلے میں کچھ ناچاقی ہوگئی تھی۔امی جان کا غصہ اتنا بڑھا کہ اتنا بڑھا کہ انھوں نے قسم کھائی کہ وہ تو کیا ان کا کتا بھی ان کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔نہ وہ ان کی صورت دیکھیں گی۔اس طرح دونوں خاندان کے درمیان ایک دراڑ سی پڑ گئی۔جمیل ماموں نے بہت چاہا کہ کسی طرح مصالحت ہوجائے مگر یہ ہٹ کہ پکی اپنی ضد پر اڑی رہیں۔اور اس مسئلے کو اپنے وقار کا سوال بنالیا۔

ادھر سلمان بھائی اس دراڑ اور معاملے کی نزاکت سے بے نیاز اپنی ماں کے دشمن کی بیٹی کی تصویر جیب میں ڈالے اس سے چوما چاٹی کر رہے تھے۔بچپن میں اس سے شادی بیاہ کے کھیل کھیلتے ہوئے سچ مچ اپنی گڑیا سے بیاہ رچانے کے خواب دیکھنے لگے۔وہ فائنل ایم۔اے میں تھے کہ دلرس آپا نے اسی کالج میں فرسٹ ایر سائنس میں اسی کالج میں داخلہ لیا۔دونوں کا تقریباً روز ہی آمنا سامنا ہوا۔کلاس میں تاریخ اور پولیٹکل سائنس کے درس لیتے، کلاس کے باہر آم کے ٹھنڈے ٹھنڈے سائے تلے خاندانوں کے درمیان پڑی ہوئی دراڑ پھلانگ کر خوابوں کے تاج محل سجائے جاتے، وعدے ہوئے قسمیں ہوئیں۔ایک دوسرے کے ساتھ جینے اور مرنے کے عہدو پیمان ہوئے۔اڑتے اڑتے ان خبروں کی سنسنی خیز سرخیاں امی کے کانوں میں بھی پڑیں تو وہ زخمی شیرنی کی طرح اپنی کچھار سے باہر نکل آئیں۔یہ میری ناک کا سوال ہے۔جمیل نے اپنی بیٹی کو بیچ میں ڈال کر مجھے زک دینے کی کوشش کی ہے۔میرا بچہ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔اسے ضرور جادوٹونے سے پھنسایا گیا ہے۔

مگر بے چاری امی جان کو کیا معلوم کہ یہ کسی دشمن کے جادوٹونے کا کرشمہ نہیں بلکہ ہیر کے حسن کا جادو تھا۔جو رانجھے میاں کو کچے دھاگے میں باندھ کر لے گیا تھا۔بلاشبہ دلرس آپا ناک نقشے اور رنگ میں سینکڑوں کی تھیں۔سلمان بھائی نے امی جان کے بہت سارے جتن کیے مگر وہ بھی نسل کی پٹھان زادی تھیں۔ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔پھر اس ڈرامے کی ہروئین خود ہی اپنے باپ کے آگے سینہ سپر ہوگئی۔وہ ہیر کی طرح اکڑ گئی کہ وہ شادی کرے گی تو اپنے ''رانجھے'' سلمان سے ورنہ کیڑے مارنے کا زہر کھا کر جان دے دے گی۔مگر کیڑے مارنے کا زہر کھانے کی نوبت نہیں آئی، اکلوتی بیٹی کی دھمکی باپ کے قدم ڈگمگا گئی، انھوں نے ہتھیار ڈال کر خاموشی سے ایک دن دونوں کے نکاح کا انتظام کردیا۔جس دن نکاح ہوا، امی جان کے حلق سے ایک نوالہ نہ اُترا۔وہ مصلے پر بیٹھی دعاؤں کے درمیان آنکھیں صاف کرتی رہیں۔انھوں نے گھر میں سب کو الٹی میٹم دے رکھا تھا کہ اگر کسی نے شادی میں شرکت کی تو وہ کچھ کھا کر جان دے دیں گی۔بس ابا جان واحد آدمی تھے، جنھوں نے دفتر جانے کے بہانے مجلس نکاح میں شرکت کی اور اپنے شکستہ دل بیٹے کو پُرنم آنکھوں سے دعائیں دیں۔شادی کے دو ماہ بعد سلمان بھائی کو پولس کے محکمے میں ملازمت مل گئی تو وہ چُپ چاپ اپنی دلہن کو لے کر بنگلور چلے گئے۔

آج اس بات کو دو سال ہورہے تھے، ان دو سالوں میں نہ بیٹے نے گھر آنے کا نام لیا، نہ ماں بیٹے کی فراق کی آگ میں تپ کر نرم ہوئی۔اِکاذُکا خبریں ملتی رہیں کہ میاں رانجھے پولس میں انسپکٹر ہوگئے ہیں اور ''ہیر'' ایک اسکول میں پڑھانے لگی ہے اور مزے میں کٹ رہی ہے۔

لیکن آج ایک غیر متوقع تار نے سب کو عجیب کشمکش اور صورت حال سے دوچار کردیا تھا سب کے ذہنو میں ایک ہی سوال ٹکرا رہا تھا۔امی جان کی عدالت سلمان بھائی کو کیا سزا دے گی اور سلمان بھائی امی کے غیض وغضب کا کس طرح سامنا کر سکیں گے۔رات کو عشا کی نماز سے فارغ ہوکر امی حسب معمول دیوان آبیٹھیں، کمرے میں ایک بوجھل سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔دفعتاً باہر گلی میں آٹو رکشا کے رُکنے کی آواز آئی۔چند لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ابا جان بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے، میں قریب ہی بیٹھی ایک کتاب پڑھنے کی ناکام کوشش کررہی تھی، کان دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے، دل گھڑی کی پنڈولم کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔دستک کی آواز سن کر میں نے دروازہ کھولا تو ٹھٹھک کر رہ گئی، سامنے سوٹ کیس ہاتھ میں لئے سلمان بھائی کھڑے تھے، ان کے پیچھے سفید گٹھری نما شیرخوار بچے کو گود میں لئے سُرخ ساری میں لپٹی لپٹائی دلرس آپا کھڑی تھیں۔سہمے سہمے خدو خال آنکھوں میں ایک اجنبی سا خوف۔وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کررہی تھیں۔میں حیران رہ گئی۔یقیناً ان کے لئے سلمان بھائی کا اپنے ماں باپ کو بھاڑ میں جھونک کر گریبان چاک پھرنا کچھ یوں ہی سی بات نہیں تھی۔یقیناً وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئیں تھیں، سلمان بھائی سوٹ کیس ایک طرف رکھ کر مجھے گلے لگالیا پھر ابا جان سے گلے مل کر امی جان کے قریب گئے۔آداب امی جان......!

(بقیہ صفحہ 19 پر)

غـــــزلیـــــات

مرغوب اثر فاطمی
RoadNo:-7.Gaya-823001
Bihar

دیکھا اُسے تو ٹوٹ چکا، پائمال تھا
خود ساختہ فصیل کا وہ یرغمال تھا
میرا ضمیر آنکھ دکھانے لگا مجھے
ہوں کون' اپنے آپ سے میرا سوال تھا
جشنِ صفاتِ ذات میں دیکھا جو جھانک کر
خود آگہی کا چہرہ متانت سے لال تھا
ذوق دُرون بینی پہ قربان جایئے
دل مضطرب تھا شوق کے شیشے میں بال تھا
انسانیت کے جسد کی تدفین میں شریک
ہر کوئی پارسائی کی عمدہ مثال تھا
یوں کر کے دیکھتے ہیں' یہ خصلت ہے آج تک
روزِ ازل بھی اپنا یہ پہلا خیال تھا
یہ کیا ستم ظریفی ہے' شاعر کو کیا ہوا!
وہ تو اثرؔ امینِ جمال و کمال تھا

سید اسلم صداؔ الآمری
22/23BooBegum Street
2nd lane,Mount Road
Chenni-600002
Mob-9444752605

الجھ کے رہ گیا وہ مختلف سوالوں میں
پڑھا جب اس نے مجھے ان گنت رسالوں میں
جو تیرگی میں بظاہر تھا واہمہ کوئی
وہ بن کے میرا یقیں آگیا اجالوں میں
مرے سخن کے وہ سانچے میں ڈھل سکا نہ کبھی
وہ جس کو بارہا دیکھا کیا خیالوں میں
نگاہ شیر کی بچوں پہ ہرگھڑی رکھو
کھلاؤ سونا سہی تم انھیں نوالوں میں
جو عیب مجھ میں ہیں وہ مجھ کو پیش کرتا ہے
اک ایسا دوست بھی میرا ہے ہم خیالوں میں
سخن کے فن سے جنھیں دور کا بھی رشتہ نہیں
شمار آج انھیں کا ہے باکمالوں میں
سند کے طور پہ اردو ادب کے جلسوں میں
ہمارے شعر پڑھے جائیں گے مقالوں میں
صداؔ یہ مشقِ سخن میری چند روزہ نہیں
کمال مجھ کو یہ حاصل ہوا ہے سالوں میں

عبدالحئی پیام انصاری
At/P.O:PairoliBazar
Via:Khajni
Dist:Gorakhpur-12

تمہارے لطف و کرم میں بھی بے نیازی ہے
تمہاری بے رخی اک پیار کی ادا سی ہے
نہ جانے کب کی تری آگ بجھ گئی ہوتی
اسے جلانے میں شامل کوئی ہوا بھی ہے
نظر جو آیا ہے سورج کئی دنوں کے بعد
تو میرے صحن میں دھوپ آگئی ذرا سی ہے
اب اس کا گھر سے نکلنا بھی ہوگیا دوبھر
حسین بھی تو وہ لڑکی بہت بلا کی ہے
مرے ہی نام سے منسوب ہوگیا یہ سفر
کہ اس کا پہلا محرّک مرا قدم ہی ہے
کبھی کمی کسی شے کی نہ ہوسکی محسوس
جو مل گیا مجھے تقدیر سے وہ کافی ہے
متاعِ درد بچی ہے فقط تمہارے پاس
پیامؔ تم نے یہ دولت کہاں چھپالی ہے

ڈاکٹر ظہیر آفاق
173,V.M>Street.1st Floor
Royapettah.Chennai.500014

بے مروت بہاروں میں تنہا ہوں میں
بے سبب انتظاروں میں تنہا ہوں میں
بے وفاؤں کے پیکر تراشے تو کیا
دل شکن غم کے ماروں میں تنہا ہوں میں
انکی ہراک خطا نام اپنے لکھی
بے خطا گنہگاروں میں تنہا ہوں میں
بے ایمانوں کی دنیا سنواری مگر
دل جلے شہر یاروں میں تنہا ہوں میں
ڈگمگاتا ہے قانون سچ پر مرے
جھوٹ کے شاہ کاروں میں تنہا ہوں میں

شمس الحق شمس (ایڈووکیٹ)
Deopur.P.O:Biribati
Dt:Cuttack-754110
Mob-9338815869

تاریک وادیوں میں چمکنے لگے ہیں ہم
بادِ صبا کی طرح مہکنے لگے ہیں ہم
بھٹی سے تپ کے آج نکلنے کے بعد ہی
کندن کی طرح پھر سے دمکنے لگے ہیں ہم
غیروں کے آگے سر کو جھکاتے نہیں کبھی
اس واسطے جہاں کو کھٹکنے لگے ہیں ہم
آپس کے اختلاف کا انجام یہ ہوا
منزل کے پاس آکے بھٹکنے لگے ہم
لبریز جام ہوگیا ملت کے صبر کا
غیض و غضب سے آج چھلکنے لگے ہیں ہم
دشمن کے ظلم و جور سے مجبور ہو کے شمسؔ
مثلِ شرارِ برق کڑکنے لگے ہیں

اصغر شمیم
C/O:BaitulQasim
12/H/1,PatwarBagan.
Kolkata-700009

سب یہ کہتے ہیں حال اچھا ہے
پھر مجھے یہ ملال کیسا ہے
سوتے سوتے میں جاگ اٹھتا ہوں
کس کے آنے کا دل کو کھٹکا ہے
شام ہوتے ہی دل اداس ہے کیوں
مجھ کو یوں کون یاد کرتا ہے
کتنا چاہا کہ دل کو بہلاؤں
کوئی صورت یہ دل نہ بہلا ہے
پیاس اصغرؔ بجھاؤں میں کیسے
سامنے ایک سوکھا دریا ہے

صابر ادیبؔ
Shahjahanpur(Bhopal)
Mob-09617008230

’سبب‘ کی قید میں رہتے ہوئے ’وتد‘ میں ہوں
خدا کا شکر ہے میں پھر بھی اپنے قد میں ہوں

مجھے نہ ناپ سکی مہر و ماہ کی حد بھی
میں بحرِ فکر کے اک ایسے جزر و مد میں ہوں

دیا ہے میں نے ہی ہر ذرّے کو پیامِ حیات
میں زندگی کا ہوں قاصد کبد کبد میں ہوں

وہ خاک بن گئی گلزار جس پہ آتش تھی
مجھے ہے فخر میں اس خاک کے جسد میں ہوں

تمہارے عہد میں قد والا بھی ہے پستہ قد
میں اپنے قد میں کھڑا ہوں مگر لحد میں ہوں

مرے عزیز تعارف مرا بس اتنا ہے
ازل کی آگ سمیٹے ہوئے ابد میں ہوں

مرے وجود سے صابر ہے تجھ میں فکرِ جمیل
میں تیری فوجِ تخیل کے ہر رسد میں ہوں

احمد امام بالا پوری
ChudiMahal.Balapur.444392
Dist:Akola(M.S)

نکل کریوں ہمارے دل سے رشتے دار جاتے ہیں
کہیں گھر چھوڑ کر جیسے کرائے دار جاتے ہیں

اُدھر ہرگز نہ جائیں گے کبھی ہم زندگی سن لے
جدھر مسند نشیں کے حاشیہ بردار جاتے ہیں

کہا کرتے تھے ہم اکثر محبت مانگنے والے
امیرِ شہر کے در کی طرف بیکار جاتے ہیں

ذرا ظلِّ الٰہی اپنی آنکھیں کھولئے ورنہ
حویلی لڑکھڑاتی ہے درو دیوار جاتے ہیں

انا کی پرورش کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے
یہاں جاگیریں کم پڑتی ہیں کاروبار جاتا ہے

محبت زندگی میں ایک ایسا موڑ لاتی ہے
جہاں معصوم بچوں سے بڑے بھی ہار جاتے ہیں

عبدالشکور پروانہ
Islampur.Makhdumpur
Bokaro-827010(jharkhand)

باغوں سے مہکتی وہ ہوا تک نہیں آتی
کوئل کی بھی انمول صدا تک نہیں آتی

جس روز سے تم آ کے مرے گھر سے گئے ہو
آنگن میں مرے تب سے بلا تک نہیں آتی

اب نیچی عمارت ہی بنانا مرے بچو
”اونچی ہوں فصیلیں تو ہوا تک نہیں آتی“

ہم لوگ بلاؤں سے سے بچیں کیسے بھلا اب
ہونٹوں پہ بزرگوں کے دعا تک نہیں آتی

کرتے رہو قرآں کی تلاوت سدا گھر میں
اس بات سے نزدیک بلا تک نہیں آتی

وہ شمع پہ دے دیتا ہے ہنستے ہوئے جاں تک
پروانہؔ کو کہتے ہو وفا تک نہیں آتی

ابرار نغمی
NearMohammadiMasjid
Raisen-464551(M.P)
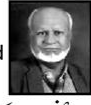
صنم مندر کے اور کعبے کے بام و در تراشے ہیں
عبادت کے مظاہر ہم نے بس پتھر تراشے ہیں

ہے یکسر مختلف کُل سے فنِ تیشہ گری اپنا
نیے بت ہی نہیں ہم نے نیے آزر تراشے ہیں

تخیل کی مری رعنائیاں کم ہی نہیں ہوتیں
تری آنکھوں نے تابندہ بہت منظر تراشے ہیں

نیے ساقی نے میخانے کی دنیا ہی بدل ڈالی
نیے مینا‘ سبو ہی کیا‘ نیے ساغر تراشے ہیں

کہیں مسجد‘ کہیں مندر‘ کہیں گرجا و گردوارہ
جبیں سائی کو ہم نے کتنے سنگِ در تراشے ہیں

یہ کس نے کہہ دیا تم سے میں تم کو بھول بیٹھا ہوں
مسائل نے تمناؤں کے میری پر تراشے ہیں

اگر آنکھوں سے گر جائیں تو نغمیؔ ٹوٹ جائیں گے
تمہاری یاد میں پلکوں پہ جو گوہر تراشے ہیں

بدر محمدی
AtChandpurFateh.P.O:Baryarpur
Dist:Vaishali(Bihar)

کارِ وفا میں اس کے ہے جور و جفا کا کام
لیتا ہے کس ادا سے کوئی کس ادا کا کام

حق ہے حسین جیسا تو باطل یزید سا
کیسے کہوں کہ جاری نہیں کربلا کا کام

روزِ ازل سے اٹھتا رہا ہے بشر کا ہاتھ
پھر بھی ہوا نہ ختم ابھی تک دعا کا کام

ہم بھی سفر میں خود کو سمجھتے ہیں خوش نصیب
کرتی ہے دھوپ سر پہ ہمارے ہما کا کام

مت جان یہ کہ مٹی کا تن مٹی ہوگیا
جب تک درونِ جسم ہے باقی ہوا کا کام

کچھ کرنے کی سکت نہیں رہتی ہے اس کے بعد
ٹھہراؤ سارے کام کا ٹھہرا قضا کا کام

محمد نوشاد نورنگؔ
102,RaushanKiran.1-RaviNagar
KhajranaRoad.Indore-18(C.G)

بڑے ارمان لے کر موسمِ غم سر پہ آیا ہے
کروں مہماں نوازی کیوں نہ میرے در پہ آیا ہے

وفا سے ناشناسی ہے ابھی ہے عمر کیا اس کی
غلط کہتے ہیں سب کہ دل مرا پتھر پہ آیا ہے

ہے صورت بت کی کچھ ایسی کہ سر سجدے میں جھک جائے
خطا بت گر کی ہے الزام میرے سر پہ آیا ہے

یہ اپنی بدنصیبی ہے کہ اس سے مل نہیں پائے
اگرچہ عید ملنے وہ ہمارے گھر پہ آیا ہے

ہے تیشہ کند‘ پتھر سخت‘ تن خستہ‘ شکستہ جاں
یہ کیسا مرحلہ اس کوہکن لاغر پہ آیا ہے

ہے تشنہ ساری خلقت اور پلانے والا اک ساقی
امیدیں لے کے عالم چشمۂ کوثر پہ آیا ہے

خطا پہ ہو کے شرمندہ کھڑے ہیں آج ہم نورنگ
کہ بخشیں گے یقیں یہ داورِ محشر پہ آیا ہے

ڈاکٹر قمرالزماں

Bankura-722183(W.B)
Mob:07076557266

شاعری تو شراب ہوتی ہے
زندگی کی کتاب ہوتی ہے
ہم سمجھتے ہیں کج ادائی کو
آپ اپنا جواب ہوتی ہے
جب بھی کہتا ہوں اس کو فتنہ گر
جل کے گویا کباب ہوتی ہے
کوئی سمجھائے نازنینوں کو
بے قراری عذاب ہوتی ہے
دکھ بھی دیتا خدا ہے اتنا ہی
جتنی سہنے کی تاب ہوتی ہے
کیوں جھمیلے میں اس کے پڑتے ہو
زندگی تو سراب ہوتی ہے
بے سلیقہ زماں برتنے سے
چیز اچھی خراب ہوتی ہے

زاہد کونچوی

521/51,EsaiTola.Kamal
SighColny.Jhansi-284003

شجر کی شاخوں پہ معصوم جب ثمر آئے
تو لوگ ہاتھوں میں پتھر لیے نظر آئے
وہ آسمان کو چھونے کی بات کرنے لگے
بدن پہ جن کے ابھی چند بال و پر آئے
جنہیں بنایا تھا تم نے شریک غم دیکھو
ابھی ابھی وہ ضمیر اپنا بیچ کر آئے
سنا ہے صبح کا سورج نکلنے والا ہے
دریچے کھولیے کچھ روشنی ادھر آئے
اب ان سے ملنے میں ہم کو کوئی گریز نہیں
انا کی چھت سے چلو نیچے وہ اتر آئے
ہمارے عزم کا تم امتحان کیا لوگے
جنوں کی چڑھتی ندی ہم تو تیر کر آئے
جو اپنے آپ میں خود معتبر نہیں زاہدؔ
ہم آج ان کو ہی نا معتبر نظر آئے

نواز غازیپوری

Vill:ChitarKoni.P.O:DidarNagar
Dist:Ghazipur-232326(U.P)

دن بدلتے رہتے ہیں بے بسی نہیں رہتی
مدتوں کسی کے گھر مفلسی نہیں رہتی
کیوں ملے کسی کو بھی یہ سکون کی دولت
گھر میں جب کسی کے بھی شانتی نہیں رہتی
ساتھ ساتھ موسم کے رنگ جو بدلتے ہیں
میری ایسے لوگوں سے دوستی نہیں رہتی
ہر گھڑی اندھیرے ہی ساتھ ساتھ رہتے ہیں
چار دن کی مہماں ہے چاندنی نہیں رہتی
آدمی کوئی بھی ہو خامیاں تو رہتی ہیں
کون ایسا ہے جس میں کچھ کمی نہیں رہتی
اے نوازؔ تنہائی میری جان لے لیتی
میرے ساتھ جب میری شاعری نہیں رہتی

اجے عالم
(اجے کمار پنڈا)

SukhwaGudam.P.O:kali
MandirRoad.Jharsuguda(Odisha)
Mob:9776031506

گھر کے یہ شکستہ در و دیوار سنبھالو
اجڑے نہ کہیں آپ کا گھربار سنبھالو
ہیں دوستی کے بھیس میں غدار سنبھالو
دشمن جو کرے پشت پہ وہ وار سنبھالو
گر کر یہ بدن کو کہیں مجروح نہ کردے
جو سر پہ ہے لٹکی ہوئی تلوار سنبھالو
ماں باپ کی آنکھوں میں کبھی آئیں نہ آنسو
وہ کرتے ہیں جی جاں سے تمھیں پیار سنبھالو
تہذیب ہے، عزت ہے، امانت ہے ہماری
اے دوست بزرگوں کی یہ دستار سنبھالو
نفرت کی، عداوت کی وبا پھیل رہی ہے
ہر موڑ پہ خطروں کے ہیں آثار سنبھالو
کہتا ہے پسِ پشت تمھیں کیا یہ زمانہ
عالمؔ ذرا اب اپنی بھی گفتار سنبھالو

ظہیر احمد ظہیر

H.No:11-1041/66,AbqariMohalla
Jeelanabad.M.S.K.Mills
Gulbarga-585103(karnataka)

زخموں کا حال کوئی یہاں دیکھتا نہیں
دنیا میں اب کسی سے کوئی واسطہ نہیں
میرے ہر ایک فعل کا مرکز وفا خلوص
اس کا صلہ ہے کیا یہ کبھی سوچتا نہیں
سب دشمنوں سے مہر و محبت کی ہے امید
احباب کے دلوں میں مگر اب وفا نہیں
صحراؤں پربتوں کا مجھے غم نہیں کوئی
راہی ہوں پیار کا میں کبھی ہارتا نہیں
ہر سو ہے ذکرِ خیر حسیں دلبروں کا اب
کوئی ظہیرؔ حال مرا پوچھتا نہیں

عظیم الدین عظیم

PLotNo:78/427,LotusGarden
Jadupur.Bhubaneswar-751019

گزری تمام زندگی راحت نہیں ملی
کرتے رہے وفا کبھی چاہت نہیں ملی
ہر کوئی اس جہاں میں پریشان حال ہے
چہرے پہ آدمی کے بشاشت نہیں ملی
رستے کی دھول بن کے بکھرتے رہے سدا
شکوہ یہی رہا کبھی الفت نہیں ملی
گزرے ہیں دن ہمارے مصیبت میں آج تک
خوش حال زندگی کی اجازت نہیں ملی
کانٹوں کے راستوں سے گزرتے رہے سدا
ہم کو کہیں بھی پھولوں کی زینت نہیں ملی
گو زندگی لٹا دی مگر اس کی چاہ میں
مجھ کو عظیمؔ اس کی محبت نہیں ملی

ایس۔کیوعالم طلعت

PumpHouseRoad.GuruNanak
Chowk.Bilaspur-495004(C.G)

پردیس سے وہ آکے مگر جان تو گیا
رستہ ہمارے گاؤں کا پہچان تو گیا
وہ ساتھ اپنے لے گیا میرا ہرایک چین
پالا تھا جس کو دل میں وہ ارمان تو گیا
اب مجھ پہ کیا گزرتی ہے یہ کس کو کیا پتہ
نادان دل تھا اس کا کہا مان تو گیا
گزرے گی زندگانی بڑے اضطراب میں
میرا سکون لے کے وہ مہمان تو گیا
احسان اس کا مجھ پہ طلعت یہ بھی کم نہیں
وہ دے کے مجھ کو درد کا سامان تو گیا

عبدالودود اجتبی

M.C.L QtrNo:B-8.Biddhijan
Masjid.P.O/Via:OrientColliary
Dist:Jharsuguda-768233

تری باتوں میں وہ خوشبو نہیں ہے
زباں پر تیری جب اردو نہیں ہے
مسخر دل کو کرلیتی ہے پل میں
کہ اس جیسا کوئی جادو نہیں ہے
گماں کرتے ہو اس پہ کس لیے تم
وہ سادھو ہے کوئی ڈاکو نہیں ہے
وہی ناکام رہتا ہے جہاں میں
جو فطرت سے اگر چالو نہیں ہے
بہت انمول ہے مٹی وطن کی
مری نظروں میں یہ بالو نہیں ہے
نظر آتی ہے محفل پھیکی پھیکی
اگر حاضر یہاں پر تو نہیں ہے

شوکت رشیدی

DewanBazar,Cuttack-(Oisha)
Mob:9337892064

مرے خدا مری ہستی کو معتبر کردے
میں تیرا راستہ چھوڑوں تو دربدر کردے
نہیں ہے جن کے مقدر میں علم کی دولت
تو اپنے فضل سے ان سب کو باہنر کردے
مصیبتوں کے شکنجے میں ہے بنی آدم
ذرا کرم اے شہنشاہِ بحر و بر کردے
اسی کو حق ہے کہ جو وقت کا مصنف ہے
وہ طول دے یا کہانی کو مختصر کردے
وہ ایسی ذات ہے چاہے اگر تو اے شوکت
قمر کو شمس کرے شمس کو قمر کردے

اعظم مچھلی شہری

Moh:Qaziana.P.O:MachhliShaher
Dt:Jaunpur-222143(U.P)
Mob-8799058827

یہ اہلِ زر تو بیچارے نہیں ہیں
جو بھوک اور پیاس کے مارے نہیں ہیں
وہ کیا جانیں گے حالت مفلسوں کی
جو دکھ میں حوصلہ ہارے نہیں ہیں
بناتے ہیں محل اپنا جو لیکن
کسی صورت وہ بنجارے نہیں ہیں
جو برساتے ہیں آکر آگ ہرسو
مرے دشمن کے طیارے نہیں ہیں
ابھی میں طفلِ میدانِ ادب ہوں
مرے اشعار فن پارے نہیں ہیں
ابھی تکمیل کا دعویٰ غلط ہے
کہ ہم کو تجربے سارے نہیں ہیں
بجھا ان سے تو اپنی پیاس اعظم
کنوئیں یہ گاؤں کے کھارے نہیں ہیں

شاہنواز انصاری

Moh:Mahtwana.Mchhli
Shaher.Jaunpur(U.P)
Mob:7398506948

سہانی رات ڈھلتی جا رہی ہے
ملن کی آرزو تڑپا رہی ہے
حسیں ہے چاند اور دلکش نظارے
عجب یہ بے خودی سی چھا رہی ہے
ہے ساعت ہجر کی ناگن کی مانند
مجھے دن رات ڈستی جا رہی ہے
اسے میں کس طرح بھولوں گا آخر
جو مدت یاد بن کر جا رہی ہے
وہ گزری ہے تری زلفوں کو چھو کر
ہوا جو مہکی مہکی آ رہی ہے
مجھے بھی شہنواز آتی ہے ہچکی
اسے بھی یاد میری آ رہی ہے

نثار علی شیخ

104,GateGlaxy.Gatanagar
Phase-1,MiraRoad.Mumbai-401107

چاند ہے کاسہ بکف بدرالدجیٰ کے سامنے
رونقیں ہیں سرنگوں شمس الضحیٰ کے سامنے
دیدنی عالم تھا دل کا جب پسِ پردہ تھا وہ
اور اب حیرت میں ڈالا اس نے آکر سامنے
بس ترا ہی نام لے کر آج اے ربِ کریم
رکھ دیا ہے اک دیا ہم نے ہوا کے سامنے
ایک دن پچھتائے گا تو اے جفا جو جان لے
یہ جفا کیا چیز ہے میری وفا کے سامنے
جانتا تو وہ بھی ہے وقعت مگر اس کے تئیں
خونِ دل بھی ہیچ ہے رنگِ حنا کے سامنے
اے حباب اس دامنِ عصیاں کو پہلے دھو تو لو
جاؤ گے کس منہ سے ورنہ تم خدا کے سامنے

کتابوں کے شہر میں

(تبصرے کے لئے دو کاپیوں کا آنا ضروری ہے)

اگر اپنی کتابوں کا اشتہار بھی دیں تو تبصرہ ترجیحی بنیاد پر جلد شائع کیا جائے گا۔ ایک صفحے کے اشتہار کی شرح ایک ہزار روپے ہے۔ تبصرے کے لئے کافی کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔ ان پر تبصرہ ترتیب وار شائع ہوتا رہے گا۔ (ادارہ)

نامِ کتاب۔ آئینۂ یگانہ (شعری مجموعہ)
شاعر۔ کاظم نائطی مبصر۔ سعید رحمانی

کاظم نائطی چینئی کے ایک کہنہ مشق اور معتبر شاعر کی حیثیت سے اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں اور اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنی شعری کاوشوں کو ''آئینۂ یگانہ'' کی صورت میں ہمارے سامنے لے کر آئے ہیں۔ یہ مجموعہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں نعتیں، نعتیہ سانیٹس اور غزلیں شامل ہیں۔ جب کہ دوسرے حصے ''معنیٔ بیگانہ'' کے تحت ''طریق'' کے عنوان سے مسدسِ کاظم شامل ہے۔ مجموعہ کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ کاظم نائطی صاحب کو بیشتر اصنافِ سخن پر دسترس حاصل ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی کے آئینے میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا عکسِ جمیل نمایاں نظر آتا ہے۔ جدید لب ولہجہ میں ان کی غزلیات میں سلاست و فصاحت کے ساتھ ساتھ فکری علویت اور شان وشوکت بھی پائی جاتی ہے۔ سماجی شعور کے ساتھ ان میں خلاقانہ قوتِ اظہار بھی ہے جس کی بنا پر یہ غزلیں انفرادیت کی حامل ہو گئی ہیں۔

ابتدا میں چند قطعات کے بعد ایک حمد یہ غزل ہے اور اس کے بعد نعوتِ پاک۔ یہ نعتیں جہاں موصوف کے حُبِّ رسول کی سرشارانہ کیفیت کی آئینہ دار ہیں وہیں ان میں سنجیدگی، متانت، لطافت، سلاست، بلاغت، روانی اور دلی سوز وگداز کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مثلاً

لفظوں میں خوشبو کو سمونے کا وقت ہے ذکرِ حبیبِ پاک میں کھونے کا وقت ہے

ان کے سبھی نعتیہ اشعار شرعی حدود کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان تمام اوصاف کے حامل ہیں جو معیاری نعت کو تشکیل دیتے ہیں۔ انھوں نے روایتی مضامین کو بھی اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ان میں حسنِ بیان، اور دلکش طرزِ ادا کے سبب ایک نئے آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے بلا تکلف انھیں ایک کامیاب نعت گو کہا جا سکتا ہے۔

ان کی غزلوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں بھی وہی فکری بلند پروازی، پُر شکوہ لہجہ، ژرف بینی، فکری ارتفاع، حالات کی تلخی اور کربِ ذات کی کسک کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ صالح قدروں کی پامالی، ہوسناکی، انسان کی درندگی، تعصب ونفرت اور فسادات جیسے المیوں کو انھوں نے خوبصورت شعری پیرہن عطا کیا ہے۔ اس ذیل میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تن کو اجلی پوشاکوں سے ڈھک تو گئے۔ من پر ایسا رنگ جمانے میں دیر لگی
کہیں سکوں کا گوشہ ملے تو جا بیٹھوں۔ تمام بھاگتے پھرتے ہیں مال وزر کی طرف
ہر شخص دوسرے کو نوچے پھرے ہے ہر سو۔ وحشت کے سارے منظر شہروں میں دیکھتے ہیں
سر کٹے گھر جلے ہر طرف خوں ہی خوں۔ شہر میں نفرتوں کا یہ خاکہ بنا

انھوں نے بعض جگہ خوبصورت استعارات وعلائم سے بھی اپنے شعروں کو گہرائی وگیرائی عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

سناٹے اوڑھ لینا کاظم کو آ گیا ہے۔ چرچا ہے اس کی چُپ کا کہرام سے زیادہ
زرد پتے دھوپ کے جنگل سے کب کے اُڑ گئے
خشک میدانوں میں اب تک بھی بجھے بیٹھے ہیں لوگ

اور سب سے افسوسناک پہلو آج کے مسلمانوں کی بے حسی ہے جس کا شدید احساس کرتے ہوئے کاظم صاحب کہتے ہیں:

گرمیٔ زیست جس نے بخشی تھی خود پڑا سو رہا ہے سپنوں میں

مختصر یہ کہ ان کی شاعری کربِ ذات سے ہوتے ہوئے کربِ کائنات کا استعارہ بن گئی ہے جس میں انفس وآفاق کے سبھی گوشے منور نظر آتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ''آئینۂ یگانہ'' اپنی منفرد شاعری کے لیے مقبولِ خاص وعام ہوگا۔ اس کی قیمت ہے ۵/سو روپے اور ملنے کا پتہ: حافظ محمد اسحاق عابد۔ 33/67 ایلیس روڈ۔ چینئی۔ 600002

نامِ کتاب:۔ انشاءاللہ (افسانوی مجموعہ)
مصنف:۔ حسن نظامی کیراپی مبصر۔ عبدالمتین جامی

دوماہی گلبن لکھنؤ کے مدیر محترم جناب سید ظفر ہاشمی نے اگست۔ ستمبر ۲۰۱۶ء کے اداریہ میں جو لکھا ہے وہ قابل غور ہے۔ موجودہ عہد کے نام نہاد بڑے افسانہ نگاروں کے یہاں کچھ ایسی بات سامنے نہیں آ رہی ہے جس سے یہ کہا جا سکے کہ اردو افسانے وقت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان میں موجودہ عہد کی تمام داستان یا حقائق سامنے نہیں آ رہے ہیں بلکہ ان نام نہاد کہنہ مشق افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں وقیانوسیت کا ایک جہان آباد ہونے لگا ہے۔ ادب تو اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ آنے والے زمانوں کے قارئین کو ادب کے مطالعہ سے ہمارے موجودہ عہد کے سماجی، ملکی یا زمانے کی صحیح صورت حال کی معلومات بہم پہنچائے گی لیکن مشاہدے میں یہ بات آ رہی ہے کہ اب بھی دیو مالائی اندازِ تحریر کو اپناتے ہوئے نام نہاد مشہور افسانہ نگار کچھ

ایسی تحریر قارئین کی نذر کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ قاری بجائے محظوظ ہونے کے بوریت سے ہمکنار ہوتا ہے۔افسوس کا مقام ہے کہ آج کے نام نہاد بڑے رسائل ان افسانوں کو صرف بڑے ادیب کے نام کو سامنے رکھ کر انہیں شائع بھی کرتے ہیں۔

لیکن فی الحال میرے سامنے ایک ایسا مجموعۂ افسانہ ہے جس کا نام ہے ''انشاءاللہ'' جس کے مصنف کچھ زیادہ نام زدہ افسانہ نگار نہیں ہیں۔انھوں نے بہت ہی مختصر تعداد میں افسانے لکھے ہیں۔لیکن ان کے افسانوں میں موجودہ عہد کی بہت سی کڑوی سچائی سموگئی ہے۔آج کے عہد میں زندگی کی لایعنیت خوف و دہشت پھیلانے والے عناصر نیز دہشت پسندی' مذہبی منافرت پھیلانے والے عناصر کے ظلم و بربریت دہشت کے ماحول میں صنف نازک کی بے بسی' ملک گیری کے دلدادہ عناصر کی دہشت انگیزی اور اس کی چکّی میں پسنے والے عام شہری نیز معصوم بچے اور عورتوں کی داستان اتنی خوبصورتی اور فنکارانہ چابکدستی سے پیش کی گئی ہے کہ بس اس کا اندزہ مطالعے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔تنویر احمد رومانی صاحب کی ترتیب شدہ حسن نظامی کیراپی کی یہ کتاب بہت ہی عمدہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھ کر سید ظفر ہاشمی صاحب جیسے افسانہ نگار اور صحافی اور حسن نظامی صاحب کے قارئین مطلقاً مایوس نہیں ہوں گے۔واقعات کے منظر کشی کے دوران حسن صاحب کے قدم کہیں بھی ڈگمگاتے نظر نہیں آتے۔وہ اپنے تحریر کے ذریعہ اپنے قارئین کو حیرت واستعجاب کے علاوہ حقیقت شناسی میں محو کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔لیکن ایک بات جو مجھے کھٹکی ہے وہ ہے اس کتاب میں شامل چند منی افسانے' وہ افسانے کم لطیفے زیادہ ہیں۔تاہم یہ بھی موجودہ زمانے میں زوال پذیر سماجیات اور انسانیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔کتاب کی قیمت ۱۰۰/روپے ہے لیکن قارئین کے پیسے اس کے مطالعہ سے وصول ہو جائیں گے۔انشاء اللہ۔رابطہ: روڈ ۱۷،مکان نمبر ۱۹۹ گرین دہلی' آزادنگر جمشید نگر ۸۳۲۱۱۵

کتاب کا نام۔تحقیق و تفہیم تحقیقی مضامین
مصنف۔ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی تبصرہ نگار۔عبدالمتین جامی

فخر الدین احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع شدہ اس کتاب میں راجستھان میں اردو زبان کی ترویج وترقی کے سلسلے میں مختلف کارکردیوں پر عزیز اللہ شیرانی کے تحقیقی مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔موصوف نے جس خوبصورتی سے وہاں کے اردو ادب' تصوف اور تراجم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ قابل توجہ ہے اور قابل تحسین بھی۔انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت اپنے وقیع مضامین میں سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔تاحیات درس وتدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد وہ اب اپنی طالب علمی کے زمانے سے ملازمت سے سبکدوشی کے زمانے تک کئے گئے تمام کاموں کو سمیٹ لینے کی کوشش میں منہمک ہیں۔

انھوں نے ادب و تحقیق کے عنوان سے ''راجستھان میں اردو کے ارتقاء کا مختصر جائزہ'' اور ''گزٹ ریاست ٹونک ۱۹۳۹ء سے سالانہ جرنل اردو (مولانا ابو الکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۲۰۱۵ء) تک ایک جائزہ'' جیسی کتاب پیش کر کے اپنی تحقیقی بصیرت کا عمدہ ثبوت فراہم کیا ہے۔اس کے علاوہ راجستھان میں تصوف وتراجم کے باب میں آزادی کے بعد راجستھان میں اردو تراجم صوفی حمید الدین ناگپوری کی فارسی تصنیفات۔سری مدبھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ۔مترجم منشی پنا لال بھارگو (ایک مطالعہ) پر خامہ فرسائی کی ہے۔نظم اور دو ہے:۔

''اختر شیرانی کی شاعری میں ترقی پسندانہ رجحان' دوہے عالم گیر'' از شاہد میر اور راجستھان کے دوہا نگار''

راجستھان کے کہنہ مشق شاعر منصوروی کی شاعری

اس طرح سے موصوف نے ۱۸ موضوعات پر تحقیقی مقالوں کو اپنی اس کتاب میں جمع کردیا ہے۔مزید معلوماتی مضامین سے مستفیض ہونے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی ''تحقیق و تفہیم'' نامی کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔جیپور راجستھان کے مشہور ناشر ہماری طاقت پبلی کیشن سے شائع یہ کتاب بہترین کاغذ اور چھپائی سے قارئین کے دلوں کو جیت لینے کی طاقت رکھتی ہے۔سرورق رنگین اور خوبصورت ہے۔قیمت محض ۳۵۰/روپے ہیں اور ملنے کا پتہ۔فرحت منزل کالی پلٹن۔نزد دیوان جی کنواں۔ٹونک راجستھان-304001

کتاب کا نام۔بنکر کی بیٹی (مجموعۂ افسانہ) افسانہ نگار۔ممتامہروترا
ترجمہ نگار۔ڈاکٹر شاہد جمیل تبصرہ نگار۔عبدالمتین جامی

ڈاکٹر شاہد جمیل اردو دنیا کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ترجمہ کے فن میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل ہے۔انھوں نے کئی کتابوں کا اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔انھوں نے شاد عظیم آبادی کے ناول پیر علی' منشی احتشام الدین کا سفرنامہ' بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ محمد یونس اور اندر دھنش خالد رحیم کا ہندی میں اور مردلا بہاری کے افسانوی مجموعہ گناہ گاروں کے درمیان' بنکر کی بیٹی (ممتامہروترا) کے تراجم اردو میں پیش کئے ہیں۔

''بنکر کی بیٹی'' کی مصنفہ ممتامہروترا ایک ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جو نہ صرف اپنی ہی زبان میں کہانیاں تخلیق کر کے چپ ہو کر بیٹھ جاتی ہیں بلکہ اس بات کی بھی خواہاں رہتی ہیں کہ ان کے افسانوں سے دوسرے زبان والے بھی محظوظ ہوں۔اس لئے بہتر صلاحیت والے مترجم کے ذریعہ اپنی تخلیقات ترجمہ کرا کے اردو یا دیگر زبانوں میں کتابیں شائع کراتی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر شاہد جمیل نے اپنے پیش لفظ میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ''ممتا کا فنی اختصاص یہ ہے کہ وہ فنِ افسانہ نگاری سے واقف اور پامال موضوعات میں بھی جدّت اور قدرت مہیا کرنے کا ہنر رکھتی ہیں۔مختلف طبقوں کے افراد کی زندگی' طرز رہائش' سوچ وذہنیت کے ساتھ انداز گفتگو سے بھی وہ آشنا ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان

کے افسانوں میں زندگی مجسّم ومتحرک نظر آتی ہے۔ پیش کردہ واقعات کو قبول کرنے اور شناسا کرداروں سے رشتہ جوڑنے میں قاری کو دشواری نہیں ہوتی۔

ممتا جی کے افسانے سلّہ' بنکر کی بیٹی' اپنا گھر' رہن' چوری' مول' ریت کا محل' بڑی بی' اے دیوی تو ہر جگہ' گھونسلہ' اپنے پرائے' ہارن وغیرہ تمام افسانوں میں موجود کردار متحرک بھی ہیں اور متوازی بھی۔ کہانی پن کو برقرار رکھتے ہوئے افسانہ نگار نے ہر کردار کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے اور بہترین افسانہ نگاری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد جمیل نے مترجم ہونے کی حیثیت سے اس کی اصلی تحقیق کو موضوع ومواد سے انحراف نہ کرتے ہوئے اپنے طور پر ردوبدل بھی کیا ہے۔ تاہم ہم جیسے قارئین کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس تخلیق میں کچھ ردوبدل واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ ہم نے اصلی ہندی رسم الخط میں لکھے ہوئے ممتا مہروترا کے افسانے پڑھے ہی نہیں ہیں۔ تاہم ترجمہ کے مطالعہ سے ہی اس بات کا اندازہ لگتا ہے کہ واقعی ممتا جی ایک اچھی افسانہ نگار ہیں۔ اور آئندہ بھی اپنی تخلیقات کو ترجموں کے ذریعہ ہمیں محظوظ کرتی رہیں گی۔ اردو کے قارئین کو اردو میں لکھنے والے افسانہ نگاروں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے'' بنکر کی بیٹی'' کا ضرور مطالعہ کریں۔ ملنے کا پتہ' پریم مہدی ہال 28۔ امینہ آباد پارک۔ لکھنؤ۔ پین کوڈ۔ 226018

کتاب کا نام۔ ٹوٹے پتے (افسانوی مجموعہ)

مصنفہ۔ چشمہ فاروقی مبصر۔ عبدالمتین جامی

چشمہ فاروقی ٹھیٹ بیانیہ انداز بیان کو اپنا کر کہانی شروع کرتی ہیں اور اس انداز کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی کہانی کو ختم بھی کرتی ہیں۔ ان کا تخلیقی رویہ گرچہ بہت متاثر کن نہیں ہوتا تاہم ان کے خلوص سے انحراف کی گنجائش نہیں۔ موصوفہ کے تخلیق کردہ تمام کردار نسوانی ہی ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں رائج جہیز اور تلک کی سولی پر لاکھوں عورتوں کی زندگیاں کس طرح برباد ہوتی جارہی ہیں اس کی قلمی تصویر بنانے میں چشمہ فاروقی صاحبہ کا وقت گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ عہد میں خوفناک حد تک ابھرتی ہوئی دہشت گردی اور خواتین پر اس کے برے اثرات کا تذکرہ بھی فنکارانہ انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن افسانہ نگار کو جس انہماک سے فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے وہ چشمہ فاروقی کے یہاں مفقود ہے۔ محض بیانیہ کے سہارے کہانی سنا دینے کو ہی افسانہ نگاری نہیں کہتے۔ علاوہ ازیں ظالم اور شرابی شوہروں کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والی خواتین پر بھی ان کا افسانہ اس مجموعہ میں شامل ہے۔ بیٹی کی پیدائش کسی کسی گھر میں ایک غم کا ماحول پیدا کردیتی ہے۔ حالانکہ وہی بیٹی کس طرح گھر میں زحمت نہیں بلکہ رحمت بن کر آتی ہے اس پر انھوں نے قاری کی توجہ مبذول کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس طرح مختلف نسوانی کرداروں کے ذریعہ چشمہ فاروقی نے سماج کو ایک مثبت پیغام دینے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔۔ اگر اس مثبت پیغام کو ہی وسیلہ بنا کر ان افسانوں کو پڑھا جائے تو چشمہ فاروقی صاحبہ بلاشبہ داد کی مستحق ہیں۔

قومی کونسل برائے اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہونے والی اس کتاب کو Educative book service نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ سرورق رنگین اور جاذب نظر ہے۔ کاغذ بھی اچھا ہے۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ہے۔ ملنے کا پتہ۔ Educatiye book service
25/3,Joga bhai.Jamia Nager.NewDelhi-110025

نام کتاب۔ دھوپ پھر نکل آئی (شعری مجموعہ)

شاعر۔ حسیب سوز مبصر۔ سعید رحمانی

حسیب سوز ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں۔ شعر وادب نقد وتحقیق اور صحافت میں ان کی گراں قدر خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری میں غزل ان کی پسندیدہ صنف سخن ہے۔ چونکہ وہ رہ سنبھل کر شعر کہتے ہیں اس لئے اب تک ان کے صرف دو مجموعے ہی شائع ہو سکے ہیں۔ اولین مجموعہ ''برسوں بعد'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اور پھر برسوں بعد یعنی کوئی آٹھ سال بعد یہ دوسرا مجموعہ جنوری ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ جس میں بمشکل ۷۰/۸۰/غزلیں ہیں اور آخر میں ۱۰/۱۱/غزلیں صرف تین تین اشعار کی ہیں۔ ۸/سالوں کے اندر غزلوں کا یہ مختصر سا اثاثہ ثابت کرتا ہے کہ دیگر ادبی امور انھیں باندھے رکھتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے تو غزل لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے کم سہی مگر اب تک جتنی بھی غزلیں کہی ہیں ان کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بقول نظام صدیقی ''ان کی غزلیہ کائنات میں بظاہر معصوم بچوں جیسی تازہ کار جمالیاتی برجستگی اور رشیوں جیسی معراجی اقداری ہوش مندی دستیاب ہوتی ہیں جو ایک شفق تاب تخلیقیت اور معنویت سے فروزاں ہے''۔

حسیب سوز کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی ایجاز واختصار ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں گرے پڑے لفظوں کو بھی محترم بنانے کا ہنر خوب آتا ہے۔ اس بات سے غرض نہیں کہ الفاظ خواہ ہندی کے ہوں یا انگریزی کے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اسی لئے ترا خالی مکان رہتا ہے۔ تو عشق میں بھی بڑا ساودھان رہتا ہے
رات خوابوں میں ہر اک شے پہ ادھیکار مرا۔ دن جو نکلا تو ہر اک چیز پرائی نکلی
جیتے جی ایک بھی چٹھی نہیں ملنے والی۔ جب تلک سانس ہے مکتی نہیں ملنے والی
خراب موڈ میں نکلے ہیں صاحبِ عالم۔ کسی کا تیر کسی پر نہ آج چل جائے
اس کا ہمارا ساتھ تو بس اتفاق تھا۔ بگڑی ہوئی مشین تھی کچھ دیر چل گئی

ہندی اور انگریزی لفظیات کے برملا استعمال نے شعر کو جہاں معنوی جہات عطا کی ہے وہیں تغزل کو بھی آنچ نہیں آنے دیا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے نغز گو شاعر ہیں جنھیں زبان و بیان پر مکمل عبور بھی ہے اور زبان و بیان میں نت نئے تجربے بھی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اردو لغت کی

توسیع کا کام انجام دیتے ہیں۔

شاعر ہو یا ادیب وہ عام آدمی کے مقابلے میں بڑا احساس ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ارد گرد رونما ہونے والے سانحات وواقعات سے گہرا اثر لیتا ہے اور انھیں شعری پیرہن میں پیش کردیتا ہے۔حسیب سوز بھی ایک ایسے ہی حساس شاعر ہیں۔چنانچہ آج کے اس انہدام پذیر معاشرے کی سچی تصویر ان کے یہاں مل جاتی ہیں۔

آج ہم دیکھ رہے کہ نیکی و بدی میں تمیز باقی نہیں رہی ،ہر طرف نفرت اور تعصب کا بول بالا ہے ،محبت اب گھاٹے کا سودا ہو چکی ہے۔غرض صالح قدروں کی پامالی اس عہد کی پہچان بن چکی ہے۔اس ضمن میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

تمام شہر نے دستار باندھ دی اس کے۔حسیب سوز جسے تم برا سمجھتے تھے

اب اس خبر سے بُری اور کیا خبر ہوگی۔خراب آدمی اچھی خبر میں آنے لگا

تم اپنا نام بتا کر ہی چھوٹ جاتے ہو۔ہمیں تو ذات بھی اپنی بتانی پڑتی ہے

اب اس گناہ کو فیشن سمجھتی ہے دنیا۔کسی کا ہاتھ کسی کی کمر میں آنے لگا

جہاں انھوں نے زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے وہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نظر رکھی ہے اور جزئیات نگاری کی عمدہ مثال قائم کی ہے۔مثلاً

یہ موم بتی بہت دیر تک نہیں جلتی ۔بہت سے نل گانا پلٹ کے آنے میں

خدا بھلا کرے ان ڈاک خانے والوں کا۔کئی مہینوں میں پہنچا وہاں جواب مرا

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ زیر نظر مجموعے کی شاعری اپنے اندر ایک انوکھا ذائقہ رکھتی ہے جس میں فکری اور لفظیاتی سطح پر ندرت اور شگفتگی اور تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔اس طرح یہ مجموعہ انفرادیت کا حامل ہوگیا ہے۔اس لئے امید واثق ہے کہ ادبی حلقہ خوش دلی سے اس کی پذیرائی کرے گا۔سبز رنگ کے خوش نما دبیز کاغذ پر چھپے اس مجلد مجموعے کی قیمت ہے دوسو روپے۔شاعر کا پتہ ایڈیٹر لمحے لمحے۔امام باڑہ اعلیٰ پور بدایوں۔243631 (یوپی)

نامِ کتاب۔شورِ عنادل (شعری مجموعہ)

شاعر۔ڈاکٹر کلب حسن حزیں مبصر۔عبدالمتین جامی

مجھے ایک بات کا خیال آتے ہی تحیّر آمیز مسرت حاصل ہوتی ہے کہ سائنس جو کہ صرف حقائقِ تخلیقات کے انکشاف میں مصروف رہنے والا موضوع ہے اور اس کے طالب علم یا علماء صرف حقیقت یعنی ہر نظر آنے والی شے کے اندر پوشیدہ رہنے والی چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں ،شاعر کیسے بن جاتے ہیں۔اس بات کا مشاہدہ ہم نے فارسی کے عظیم سائنس داں نیز شاعر خیام کے اندر کیا۔آج کے دور میں بھی کئی ایسے عظیم شاعر و نقاد و نیز اردو کے جید عالم موجود ہیں جن کا تعلق ریاضی یا اس طرح کے دوسرے خشک موضوعات سے ہے۔ڈاکٹر کلب حسین حزیں کے متعلق میرا گمان تھا کہ وہ شاید اردو کے استاد رہ چکے ہیں اور شاعر بھی ہیں۔لیکن ''شورِ عنادل'' میں لکھے گئے تقریظ میں شرافت حسین صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ کلب حسین حزیں صاحب ان کے معالج رہ چکے ہیں جو کہ ان دنوں مختلف جسمانی امراض کا شکار ہو کر اپنے دولت کدے ہی میں مقید ہو چکے ہیں۔بہر کیف ان کی اپنی شاعری کے سلسلے میں خود کلب حزیں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ انھیں سمجھنے میں کافی مدد کرتا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے سلسلے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی شاعری میں ادب برائے زندگی کا التزام ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں تخلیقی مضمرات اور فنی لوازمات جو شاعری کا جزو لاینفک ہے ،مفقود ہونے کا اعتراف کیا ہے۔تاہم ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہر شعر میں جوش وولولہ کا طوفان موجیں مار رہا ہے۔جو کہ ظلمتوں سے اور بورژوائی طاقتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔اس میں زندگی کی دھڑکنیں ہیں ،آسودگی ہے ،ساتھ میں مجبور افراد کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو ہیں اور خوشیوں اور غموں کی آنکھ مچولی بھی ہے۔بہر کیف ہم ان کی شاعری میں انھیں کے دعویٰ کردہ موضوعات کی تلاش کرنے کی سعی کریں گے۔

ناچیز پہلے ہی اس بات کا اعادہ کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ موصوف کا یہ دعویٰ کہ ان کی شاعری ادب برائے زندگی کی قائل ہے ،کس حد تک غلط ثابت ہوتا ہے۔مثلاً

تنہا جو چھوڑ کر گیا غم کے حصار میں ۔اس بےوفا کا آج بھی کیوں انتظار ہے

ان کا تو دل پگھل نہ سکا میری بات سے ۔حالانکہ میں نے اشک کے دریا بہا دیے

بلبلیں باغ میں گریہ کرتی رہیں ۔گل کو بادِ صبا جب مسلتی رہی

اوپر درج کئے گئے اشعار کی طرح پچاسوں اشعار پائے جاتے ہیں جن میں وہی گل و بلبل اور ساقی و شراب جیسے فرسودہ خیالات کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔بہر حال ان کی غزلیں چاہے خود ان کے دعوے سے مطابقت نہ رکھتی ہوں پڑھنے سے مگر تعلق رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنی کتاب شائع کرنے سے قبل کسی اچھے استاد شاعر کو دکھانا چاہئے تھا۔کیونکہ انھوں نے اپنی غزلیں کہتے وقت کئی خاص بحروں کے استعمال میں غلطیاں کردی ہیں۔ایک مصرع کسی ایک بحر میں تو دوسرا مصرع کسی اور بحر میں کہہ دیا ہے۔

میں نے ان کی غزلوں کے مجموعے میں کوئی اٹھارہ جگہ بحر و اوزان کی غلطیاں دیکھیں۔اس مختصر سے تبصرے میں ان کی تفصیل لکھنے سے قاصر ہوں۔البتہ جو چھوٹی چھوٹی بحروں میں ان کی غزلیں ہیں بہت اچھی ہیں لیکن بحر مضارع یا بحر ہزج کو گڈمڈ کر کے انھوں نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں بھی غلطیوں کی بوچھار ہوگئی ہے۔امید ہے کہ آئندہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھیں گے۔تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیشتر غزلیں وارداتِ قلب اور مجروح محسوسات وجذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں اور لائقِ مطالعہ بھی ہیں۔دعا ہے کہ مجموعے کو قبولیتِ عام حاصل ہو۔قیمت ہے دوسو روپے اور شاعر کا پتہ:۔محلّہ سکراول (ایسٹ)۔ٹانڈہ۔امبید کرنگر۔224190 (یو۔پی)

نام کتاب: اردو غزل کی سرحدیں (علیم صبانویدی کے مضامین)
مرتب: فاروق جائسی　　　　مبصر: عبدالمتین جامی

تمل ناڈو کے بابائے اردو علیم صبانویدی برصغیر ہندو پاک ہی میں نہیں بلکہ دنیائے اردو کے ادبی حلقوں میں ایک مشہور نام ہے۔ انھوں نے گزشتہ چالیس پچاس سالوں سے اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اس کی بہت کم مثال ملتی ہے۔ شعری ادب، نثری ادب تنقید و تحقیق کے علاوہ بطور خاص دکن کو ساری اردو دنیا سے جوڑنے کی ان کی کاوش نا قابل فراموش ہے۔ ''اردو غزل کی سرحدیں'' کے نام سے شائع فاروق جائسی کی مرتب کردہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں بابائے اردو کے مختلف ادوار میں لکھے گئے تنقیدی مضامین و مختصر تبصروں کو جمع کیا گیا ہے۔ علیم صبا نویدی صاحب نے اردو کے تقریباً سبھی بڑے اور مشہور شعراء کی کتابوں پر تبصراتی مضامین قلم بند کئے ہیں جس میں بانی، عشرت ظفر، وزیر آغا، علقمہ شبلی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر گیان چند جین، فضا ابن فیضی، غلام مرتضٰی راہی، شکیل مظہری، آزاد گلاٹی، حفیظ بنارسی، شہر یار، ندا فاضلی، کاوش بدری، مغنی تبسم، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، فضیل جعفری، مختار بدری وغیرہم سے لے کر فاروق جائسی پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو یکجا کر کے فاروق صاحب نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ خود فاروق جائسی صاحب جو کہ خود ایک اچھے مضمون نگار اور شاعر ہیں اس کتاب کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ ''اردو غزل کی سرحدیں'' میں جو بھی مضامین شامل ہیں انھیں مختصر تبصرہ کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں علیم صبانویدی نے شعراء کے کلام پر جو گفتگو کی ہے وہ ان کا فی البدیہہ تاثر ہے۔ اس میں مضمون نگاری کی کاوش جیسی کوئی بات نہیں ہے مگر اس میں عطرِ مضمون کی خوشبو ضرور محسوس کی جا سکتی ہے''۔

ناچیز کے خیال میں علیم صبانویدی صاحب کے اس مجموعے کو اردو دنیا کے تمام قارئین پسندیدہ نگاہوں سے قبول کریں گے۔ قیمت صرف ۴۰۰/روپے ہے اور تمل ناڈو اردو پبلی کیشن چینئی میں طبع ہوئی ہے۔ ملنے کا پتہ: فلیٹ نمبر 402- سنگیتا اپارٹ منٹ 14/29 کارل وائز۔ کانپور، 208001

نام کتاب: قندیل　　　　(رباعیات)
مصنف: کوثر صدیقی　　　　مبصر: عبدالمتین جامی

کوثر صدیقی صاحب ہمارے عہد کے بڑے رباعی گو کی حیثیت سے اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انھوں نے تقریباً دو ہزار سے زائد رباعیاں کہی ہیں۔ رباعی جیسی ادق صنف سخن میں ان کو کس قدر ملکہ حاصل ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس صنف میں مروجہ اوزان کو لے کر نیا تجربہ ''ترانہ'' کے نام سے کیا۔ جو کہ ناچیز کے خیال میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ میں نے بھی کئی ترانے لکھے جو کہ انھیں کی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی کاروانِ ادب میں بھی شائع ہوئے۔

میں موصوف کی رباعیوں پر کچھ لکھنے سے قبل انھیں کے لکھے ہوئے پیش لفظ ''بنام حرف اول'' پر کچھ خامہ فرسائی کرنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے کہ ناچیز کے خیال سے خود مصنف (شاعر) اور کچھ ادب نواز قاری متفق نہ ہوں۔ بہر کیف موصوف نے تو حرفِ اول میں رباعی کی مختصر ترین تاریخ بیان کرتے ہوئے اردو کی استاد شعراء کی غلط فہمیوں پر بھی روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے کہ رباعی گوئی بہت ہی مشکل ترین فن ہے۔ لیکن دراصل رباعی گوئی کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ بہت ہی آسان ہے (بقول کوثر صدیقی صاحب) انھوں نے لکھا ہے کہ غزلیں لکھنے کے لئے کئی بحور اور اوزان جاننے کی ضرورت ہے لیکن رباعی تو بس ایک ہی بحر میں کہی جاتی ہے۔ ناچیز کا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی صرف ایک ہی وزن یعنی مفعول مفعول مفاعیل مفاعی لن یا مفاعیل فعل پر ہزاروں رباعیاں جمع کر دے تو بھی رباعی کا شاعر بن سکتا ہے۔ اگر کوئی چوبیسوں اوزان کو خلط ملط کر کے بھی رباعی گوئی کرے تو بھی رباعی کا شاعر بن سکتا ہے۔ یہ تو نقادوں کا کام ہے کہ دونوں طرح کے رباعی گو شعراء کے درمیان خط امتیاز کھینچے۔ دیگر بات یہ ہے کہ بات بحور اوزان کی سختی کی نہیں بلکہ رباعیوں کے چاروں مصاریع کے درمیان ربط باہمی کی ہے۔ اکثر شائع ہونے والی رباعیوں میں ربط وضبط کا فقدان نظر آتا ہے۔ پھر بھی وہ خود کو رباعیوں کا استاد تصور کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ضروری ہے کہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے رباعیوں کا استاد کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے۔

بہر حال بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ کوثر صدیقی صاحب ایک کامیاب رباعی گو شاعر ہیں۔ موجودہ کتاب ''قندیل'' میں ان کی تقریباً ۴۵۲/رباعیاں شامل ہیں۔ ناچیز تو خود بھی اس طرح کی رباعیاں کہنے سے قاصر ہے کہ ایک ہی وزن پر مسلسل رباعیاں کہتا جائے۔ ان کی رباعیوں کے چاروں مصاریع جو ربط وضبط پائی جاتی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

موصوف کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے اور اپنے سینے کو مسوس کر رہ جائیے۔

مکّار شکاری کو ملے عیش و آرام۔ تلوار ہے کمزور کے سرت پر لٹکی
معصوم پرندوں کو ملے قیدِ دوام۔ کمزور کا دنیا میں ہے جینا بھی حرام

اس کتاب کی قیمت ہے ۱۵۰روپے اور شاعر کا پتہ: زیب وِلا، 79-A گنوری مین روڈ، بھوپال۔ 462001

نام کتاب: حیرت فرخ آبادی فن اور فن کار　　(فن و شخصیت)
ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف　　　　مبصر: عبدالمتین جامی

ڈاکٹر ہمایوں اشرف صاحب ہمارے عہد کے ایک بڑے محقق اور نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ کر آج تک اردو ادب کی آبیاری کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ ''حیرت فرخ آبادی فن اور فن کار'' کے نام

سے یہ کتاب ہمایوں اشرف صاحب کی ترتیب شدہ کتاب ہے جس میں موصوف نے بڑیعرق ریزی سے حیرت فرخ آبادی صاحب کی زندگی کے تقریباً ہر گوشے پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب میں حیرت صاحب کی نجی زندگی اوران کے خاندانی پس منظر پر علاوہ ادبی دنیا سے ان کی بے لوث وابستگی کو اجاگر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی۔

حیرت فرخ آبادی صاحب کا اصلی نام جیوتی پرساد مصرا ہے۔ان کے آباواجداد الہ آباد کے ایک برہمن زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے اوران کے نانا افغانستان کے پٹھان مسلم خاندان کے فرد تھے۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ خودان کے والد شری متھرا پرساد مصرا عیسائی تھے۔ان کے نانا نے جن حیرت انگیز حالات کے تحت عیسائی دھرم اختیار کیا حیرت صاحب نے اس کا تذکرہ بھی اس کتاب میں ''کچھ میرے خاندان اور میرے متعلق'' کے عنوان سے کیا ہے جو کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کتاب میں حسب ذیل عنوانات کے تحت مضامین کو قلم بند کیے گئے ہیں۔ پہلے تو ''آئینۂ حیرت'' کے عنوان سے حیرت فرخ آبادی صاحب کا مکمل تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی کاوشوں پر مکمل روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے پھران کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔پھر حیرت صاحب کی شاعری اور شخصیت پر لکھے گئے مختلف ادبا ءشعرا نیز نقاد کے مضامین کو شامل ہیں جن کی تعداد ۳۰؍ ہے۔ حیرت پر قلم بند کرنے والے ادباء وشعراء میں بطور خاص پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر وہاب اشرفی، فضل امام، صدیق مجیبی، علیم اللہ حالی، علیم صبا نویدی، پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان مضامین کو ترتیب دینے کے بعد ہمایوں اشرف صاحب نے ''نقد پارے'' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں ڈاکٹر خواجہ اکرم، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، مجید رشیدی اور ڈاکٹر حسن نظامی کے مضامین شامل ہیں۔اس کے بعد خطوط کے عنوان سے ایک باب ہے جس میں ہمارے عہد کے تقریباً سبھی بڑے ادباء وشعرأ کے خطوط شامل ہیں۔ مثلاً وارث علوی، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر شارب ردولوی، شمیم احمد حنفی، چندر بھان خیال، یوسف ناظم، ندا فاضلی، غلام مرتضیٰ راہی، رؤف خیر وغیرہم۔

اخیر میں حیرت فرخ آبادی کی شعری تخلیقات کو شامل کر کے ان کا مکمل تعارف پیش کیا ہے جس میں ان کی غزلیات اور قطعات کے علاوہ چند نظموں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ حیرت صاحب کی تخلیقات کی ایک جھلک دیکھنے سے ہی ان کی تخلیقیت افروزی کا پتہ چلتا ہے۔

ان کی حیرت انگیز زندگی نیز ان کی تخلیقات میں نہاں انسانیت نوازی اور دیگر مثبت پہلوؤں کا مشاہدہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمایوں اشرف صاحب کی اس قابلِ قدر کتاب' کا مطالعہ کیا جائے۔ قیمت ۴۰۰؍روپے اور ملنے کا پتہ۔حیرت فرخ آبادی، کھوسلہ ہاؤس، گراؤنڈ فلور، نارتھ آفس پاڑا، ڈرونڈا۔رانچی 834001

نام کتاب: جھیل تن میں چاندتارے اُتر گئے کئی (شاعری)

شاعر شفیق پروین مبصر: عبدالمتین جامی

زیر مطالعہ شعری مجموعہ ''جھیل تن میں چاند تارے اتر گئے کئی'' شفیق پروین کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔اس کتاب پر ڈاکٹر فوزیہ چودھری، الطاف حسین شاداب بے دھڑک، سمن اگروال، محمد یعقوب یگانہ دھرم کوی اور عثمان شاہد جیسے شعراء وقلم کاروں نے تقریظات لکھے ہیں جن کے مطالعہ سے شفیق پروین جیسی عمر رسیدہ مگر پختہ شاعرہ سے اچھا خاصا تعارف ہو جاتا ہے۔ آج کل عموماً مختلف مشاعروں کی محفلوں میں شاعرات کو مدعو کیا جاتا ہے اورانھیں بھاری معاوضہ بھی پیش کیا جاتا ہے جو اپنی جادو بھری آواز سے سامعین کو مسحور کر دیتی ہیں۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ وہ تمام شاعرہ جو مشاعروں کی محفلوں کو لوٹنے میں ماہر ہوتی ہیں وہ محض اپنی اداکاری اور خوش الحانی کا ہی فائدہ اٹھاتی ہیں۔کلام عامیانہ اور غزل گو حسینہ سامعین کو اور کیا چاہیے؟ لیکن شاعری کے سنجیدہ قارئین یا سامعین اس موقع پر صرف سر دھنتے رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بس۔

تاہم اس پُر آشوب دور میں بھی شفیق پروین جیسی سنجیدہ شاعرہ جن کو شاعری کے رموز کا بخوبی ادراک ہے جو شاعری کو صرف سامعین کو جمائے رکھنے کا فن نہیں سمجھتی ہیں بلکہ اپنے جذبات واحساسات کے کینوس پر ابھرنے والے سبھی خیالات کو فن کارانہ چابک دستی سے قرطاس پر بکھیرنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔

ہاں! شفیق پروین کی شاعری میں ناچیز نے ان کے ترقی پسندانہ خیالات کے اظہار کے علاوہ ان کی انسان دوستی کے رجحانات اور ملک میں کرم خوردہ جمہوریت کی واپسی کی چاہ کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔سارے عالم میں خواتین کی کسمپرسی کے حالاتِ زندگی کا وہ صحیح اندازہ لگاتی نظر آتی ہیں۔ شفیق پروین محض شاعری سے ہی دلچسپی نہیں رکھتیں بلکہ سیاست کے کارزار میں بھی وہ نبرد آزما نظر آتی ہیں۔تاہم یہ بات بھی صحیح ہے کہ شفیق صاحبہ کی شاعری کا مرکز ومحور وہی عشق ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ بظاہر ان کا عشق مجازی، عشق حقیقی کی طرف مراجعت کر جاتا ہے۔ان کا عشق تمام دنیا کے تمام دکھ درد جھیلتے مایوس اور محروم انسانوں سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

بہر کیف شفیق پروین صاحبہ کی اس خوبصورت کتاب میں شامل غزلوں، نظموں اور قطعات کے مطالعہ کے بعد ناچیز کے ذہن میں جو تاثرات ابھرے یہاں پیش کر دیا ہے۔ فنّی خامیاں جو ان دنوں موصول ہونے والے شعری مجموعوں میں اکثر نظر آتی ہیں اس مجموعہ میں تقریباً نہیں ہیں۔قارئین کی دلچسپی کے لئے موصوفہ کا ایک خوبصورت شعر درج ذیل کر کے میں اس تبصرے کو ختم کر رہا ہوں۔

شہرِ نفس سے یارب دے مجھ کو اذنِ ہجرت
پنجرے سے جسم و جاں کے پرواز چاہتی ہے

اس کتاب کی قیمت ہے ۳۰۰/روپے اور شاعرہ کا پتہ: دوکان نمبر ۴/عقبیٰ مسجد کمپلیکس ڈاکٹر ایس۔آر۔کے نگر پوسٹ۔بنگلور۔560077

نامِ کتاب۔عمر گزشتہ کی کتاب (خودنوشت حیات)

مصنف۔ہارون بی اے **مبصر سعید رحمانی**

صحافت کے میدان میں ہارون بی اے ایک بڑا نام ہے۔ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہفت روزہ ''بیباک'' سے ہوا جس کا اولین شمارہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ان کی ادارت میں یہ ہفت روزہ مسلسل ۴۰/برسوں تک پابندی سے شائع ہوتا رہا اور آج بھی شائع ہوتا ہے مگر اب اس کے مدیر محمد اسمٰعیل ہیں کیونکہ ۲۰۰۶ء سے ماہنامہ بیباک کی ادارت ہارون صاحب نے سنبھال لی ہے۔یہ دونوں رسالے ہارون صاحب کی حق گوئی اور بیباکی کے مظہر ہیں۔

اس وقت وہ عمر کے ۸۶/ویں زینے پر کھڑے ہیں جہاں شام کے سائے نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ایسے میں ہر آدمی تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اللہ کا کرم ہے کہ ہارون صاحب ابھی بھی چاق وچوبند ہیں اور ان کے اشہب قلم کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

ان کی زندگی جن نشیب وفراز سے گزری اور جو مشاہدات و تجربات انھیں حاصل ہوئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ ان سبھوں کو سمیٹ کر کتابی شکل دے دی جائے۔نتیجے میں یہ خودنوشت سوانح عمری بعنوان ''عمر گزشتہ کی کتاب'' ہمارے سامنے ہے۔بقول عبدالاحد ساز: ''ان کی یہ خودنوشت قارئین کے لئے بڑی ہی قربت اور رغبت کا باعث ہوگی کہ یہ ان کی گزاری ہوئی زندگی کی نہیں بلکہ ایک طویل بھرے پُرے دور کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کے ساتھ جی ہوئی زندگی کی روداد ہے۔''

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتادوں کے سوانح نگاری کا آغاز یورپ میں ہوا اور سترہویں صدی کے نصف آخر میں اسے مستقل صنف کی حیثیت دے دی گئی۔اردو میں یہ صنف انگریزی زبان سے آئی ہے۔اب تک اردو میں بہت ساری سوانح عمریاں لکھی جاچکی ہیں۔ان میں مولانا محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' سر سید کی آثار الضادید وغیرہ کافی مشہور ہیں۔مولانا حالی کا شمار جدید سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔حیات سعدی لکھ کر انھوں سے اس فن کی بنیاد رکھی۔خودنوشت سوانح عمری اسی کی ایک شاخ ہے جسے اس لئے مشکل سمجھا جاتا ہے کہ اس میں اپنی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی پیش کرنا ضروری ہے۔وہی خودنوشت سوانح نگار کامیاب تصور کیا جاتا ہے جس نے بیباکی سے اپنی خامیاں بھی اُجاگر کی ہوں۔اس کے علاوہ زبان وبیان کی سادگی اور شگفتگی بھی ضروری ہے۔زبان اگر ثقیل اور گنجلک ہو تو قاری دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کے لئے مغز ماری کیوں کرے گا۔

اس تناظر میں ہارون صاحب کی خودنوشت پر نظر ڈالیں تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انھوں نے بڑی سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔طرز ادا اس قدر دلکش ہے کہ ۲۸۰/صفحات کو محیط اس ضخیم کتاب کو ایک ہی نشست میں ختم کرنے کے لئے قاری پڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔اس طرح کہا جائے تو یہ سوانح عمری جہاں ہارون صاحب کے تجربات ومشاہدات سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے وہیں ایک ادبی شہ پارے کی حیثیت بھی اسے حاصل ہے۔

یہ پوری کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں پہلے تین ابواب میں ان کی ابتدائی زندگی اور تعلیمی مراحل کے ساتھ ایسے دلچسپ واقعات کا تذکرہ ہے جو ان کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوئے۔چوتھا باب ان کی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔پانچواں باب سوویت روس کے سفرنامے کی روداد پیش کرتا ہے اور ناچیز کی رائے میں یہ سب سے اہم باب ہے۔انھوں نے روس کا سفر اس وقت کیا تھا جب وہ بکھرا نہیں تھا۔روس میں اپنے مشاہدات کی اس طرح تصویر کشی کی ہے کہ قاری بھی ان کے ساتھ سیر کرتا محسوس کرنے لگتا ہے۔اس کے مطالعہ سے وہاں کے لوگوں کے اخلاق واطوار کے ساتھ ان کے رہن سہن کی جانکاری بھی ملتی۔یہ غلط فہمی بھی دور ہوجاتی ہے کہ سویت روس میں مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی جبکہ ہارون صاحب بتاتے ہیں کہ وہاں آباد مسلمان نہ صرف اسلامی طرز کا لباس پہنتے ہیں بلکہ اپنے مذہبی فرائض بھی آزادی سے ادا کرتے ہیں۔آخری ابواب ان کی ادبی،صحافتی،ثقافتی سرگرمیوں سے روشناس کراتے ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہارون صاحب نے اپنے عہد کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے جو آج کی نئی نسل کی فکر کو محرک کرنے میں یقیناً معاون ہوگا۔امید ہے کہ اہل ادب خوش دلی سے اس کی پذیرائی کریں گے۔اس کی قیمت ۳/سو روپے ہے اور ناشر ہیں: اسکس لائبریری۔کیفی اعظمی روڈ،مقابل A.T.T ہائی اسکول۔مالیگاؤں۔☆☆

Unfiled Notes Page 69

طرحی مشاعرہ

مصرعِ طرح ”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“ پر غزلیں پیش ہیں۔ اگلے شمارے کے لیے طرح نوٹ فرمائیں: ”بہت ہندو مسلماں ہیں کوئی انساں نہیں ملتا (باقر رضوی) قوافی: انساں، ساماں، حیراں غیرہ۔ ردیف۔ ”نہیں ملتا“۔ پانچ اشعار پر مشتمل آپ کی طرحی غزل ۳۰؍مئی ۲۰۱۷ء تک ہمیں مل جانی چاہیے۔ رسالہ اگر تاخیر سے ملے تو وصول یابی کے ایک ہفتے کے اندر ارسال کر سکتے ہیں۔ (ادارہ)

عبدالمجید فیضی (سمبلپور)
موبائل۔ 9778291038

پیکرِ حسن زمانے سے چھپاؤں تیرا
خاکہ قرطاسِ تصور پہ بناؤں تیرا

بس سرِ راہ نگاہیں تو ملا کرتی ہیں
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

جلوہ گر ہے تو مرے دل کے نہاں خانے میں
کیوں پتہ اور کہیں جاکے لگاؤں تیرا

لذّتِ زخمِ دل و زخمِ جگر تیری عطا
چشمِ جاناں! میں کرم کیسے بھلاؤں تیرا

کوئی رودادِ الم فیضی سے سنتا ہے کہاں
دلِ بسمل میں کسے قصہ سناؤں تیرا

قدیر احمد قدیر (گڈک، کرناٹک)
موبائل۔ 09980208578

التفات اور کرم ہر گھڑی پاؤں تیرا
غیر ممکن ہے میں احسان بھلاؤں تیرا

کچھ تو مجبوری تری راہ میں حائل ہوگی
بے وفا کہہ کے بتا دل کیوں دکھاؤں تیرا

زندگی اپنا تعارف ہی کرادے مجھ کو
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

درد ہی درد ٹپکتا ہے تری باتوں سے
قصۂ درد کیوں دنیا کو سناؤں تیرا

زخمِ الفت بھی مرے ساتھ ہی جائے گا قدیرؔ
ہو اجازت تو میں یہ زخم دکھاؤں تیرا

مفتاح اعظمی (چاپدانی)
موبائل۔ 8478987508

دل کے آئینے میں ہر عکس میں پاؤں تیرا
اور چاہوں کہ کوئی نقش بناؤں تیرا

مجھ میں عادت نہیں احسان فراموشی کی
میں کھلے دل سے ہی احسان جتاؤں تیرا

تو اگر ساتھ مرا دے تو یہی وعدہ ہے
زندگی بھر کے لیے ساتھ نبھاؤں تیرا

نام جو پیدا کیا ملکِ ادب میں تو نے
دل یہ چاہے کہ کوئی جشن مناؤں تیرا

نام سے تیرے ابھی تک نہیں واقف مفتاحؔ
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

سبطین پروانہ (کٹیہار، بہار)
موبائل۔ 9472217246

سب کو پیغامِ اخوت میں سناؤں تیرا
عیب اپنے نہ ہنر کو میں چھپاؤں تیرا

تو ہے محسن بھی، مسیحا بھی، مرا رہبر تو ہی
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

تو نے چہرے پہ لگا رکھا ہے نقلی چہرہ
اصل جو روپ ہے وہ سب کو دکھاؤں تیرا

تیری ہر ایک ادا دل میں اتر جاتی ہے
دل کو گرویدہ میں پھر کیوں نہ بناؤں تیرا

میرا افسانہ کوئی سنتا نہیں پروانہؔ
کیوں یہ قصہ بھلا لوگوں کو سناؤں تیرا

عرفان صدیقی صاحب کی اسی غزل سے طرح دی گئی تھی

عکس کیا آئینہ داروں کو دکھاؤں تیرا
پہلے تمثال کوئی ڈھونڈ کے لاؤں تیرا

کون پا سکتا ہے کھوئی ہوئی خوشبو کا سراغ
کن ہواؤں سے پتہ پوچھنے جاؤں تیرا

تُو مرے عشق کی دنیا کے زیاں کا سچ ہے
کیوں کسی اور کو افسانہ سناؤں تیرا

پچھلے موسم میں تری خوش بدنی یاد کروں
راکھ کے ڈھیر میں اک پھول کھلاؤں تیرا

تُو مجھے کتنے ہی چہروں میں نظر آتا ہے
کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا

حمید عکسی (ورنگل)
موبائل۔ 9000719016

کوئی پوچھے تو میں کیا حال بتاؤں تیرا
میں ہر اک شخص سے کیوں راز چھپاؤں تیرا

تیرا پردہ بھی رہے اور میری بات بنے
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

گیت وہ کون سے ہیں جن کو خوشی سے گاؤں
سامنے تیرے نہ کیوں گیت سناؤں تیرا

تو ہی بتلا تیری فرقت میں گزاروں کیسے
سامنے گھر کے مرے، گھر میں بناؤں تیرا

تیرے چھپنے ہی سے پیدا ہیں جنوں کے آثار
بن کے عکسیؔ نہ کیوں اب پردہ اٹھاؤں تیرا

امجد سلیم (کریم نگر)
موبائل۔ 9550664623

دل کے آئینے میں ہر عکس سجاؤں تیرا
اور میں ناز بصد شوق اٹھاؤں تیرا

شوق سے عید کی خوشیوں کو منالے تو بھی
یاد کا جشن ادھر میں بھی مناؤں تیرا

خانۂ دل کو اجالوں سے سجانے کے لئے
دیپ یادوں کا شب و روز جلاؤں تیرا

میں ترے نام سے واقف ہی نہیں ہوں اب تک
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

تو اگر ساتھ دے امجدؔ کا رہِ ہستی میں
عمر بھر کے لئے میں ساتھ نبھاؤں تیرا

ساغر ملارنوی (راجستھان)
موبائل۔

دل کو گرویدہ صنم کیسے بناؤں تیرا
ستم اور طُرفہ ستم کیسے بھلاؤں تیرا

تو کبھی دشمنِ جاں ہے تو کبھی جانِ جاں
بارِ غم تو ہی بتا کیسے اٹھاؤں تیرا

کبھی شعلہ، کبھی شبنم، کبھی گل ہے، کبھی خار
”کوئی پوچھے تو میں کا نام بتاؤں تیرا“

زخم دیتا ہے تو ہر روز مجھے تازہ صنم
پھر بھی ہر ایک ستم ہنس کے اٹھاؤں تیرا

گو کہ نفرت کی وبا پھیلی ہے جگ میں ساغرؔ
سب کو پیغام محبت کا سناؤں تیرا

یونس عاصم (ڈھینکانال، اڑیسہ)
موبائل۔ 7789811686

پیکرِ حسن کو آنکھوں میں سجاؤں تیرا
دل کے آئینے میں ہر عکس دکھاؤں تیرا

ایک ملکہ کی طرح تیری رہائش کے لئے
اک محل وادیِ دل میں بھی بناؤں تیرا

لوگ جنت کی کوئی حور تجھے سمجھیں گے
رنگ اور نور سے چہرہ میں سجاؤں تیرا

یوں تو محبوب ہے، معشوق ہے، دلبر تو ہے
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

کس طرح دیکھیں گے وہ چہرۂ انور عاصمؔ
مجھ میں قدرت نہیں یہ پردہ اٹھاؤں تیرا

سعید رحمانی
کٹک

لوحِ الفاظ پہ ہر نقش بناؤں تیرا
اور زمانے کو بھی میں جلوہ دکھاؤں تیرا

جبکہ ہر دم تو مرے دل میں مکیں رہتا ہے
میں پتہ کس لیے پھر ڈھونڈنے جاؤں تیرا

جس کی خوشبو سے مہک اٹھے مشامِ جاں تک
باغِ ہستی میں وہی پھول کھلاؤں تیرا

یاد کرتے ہیں تجھے لوگ کئی ناموں سے
”کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا“

داستاں میری سنے، ہے تری خواہش یہ سعیدؔ
مجھ کو ارماں ہے کہ افسانہ سناؤں تیرا

ادب پیما
(ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں)

ڈاکٹر قطب سرشار کی تازہ تنقیدی کتاب
رباعیات امجد حیدرآبادی کا موضوعی تناظر

ایم اے نعیم نائب صدر اردو تلگو لٹریری اسوسی ایشن کے بموجب اردو ادب کے نامور ادیب وشاعر نقادو محقق ڈاکٹر قطب سرشار کی تازہ اور دسویں تنقیدی کتاب رباعیات امجد حیدرآبادی کا موضوعی تناظر چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔ اس کتاب میں شہنشاہ رباعیات حضرت امجد حیدرآبادی کی رباعیات کا تجزیہ اور تنقیدی جائزہ ایک طویل گفتگو کے اسلوب میں شامل ہے۔حضرت امجد کی رباعیات جو قرآنی آیات کے تناظر میں کہی گئی ہیں ڈاکٹر قطب سرشار نے آیات کے حوالوں کے ساتھ رباعیات کے موضوع پر گفتگو کی ہے۔طویل گفتگو پر مبنی یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے۔فہرست اور پیش لفظ کے بغیر اس کتاب کو تنقید کے طالب علم نئے زاوئیہ نگاہ سے پڑھیں گے۔ ڈاکٹر قطب سرشار نے اس سے قبل شاعری تنقیدی تحقیق اور ترجمہ نگاری پر مبنی اردو دنیا کو نو کتابیں دی ہیں۔امید ہے یہ دسویں کتاب اردو حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

یومِ جمہوریہ کے موقع پر ادبی محاذ کے دفتر میں ایک شعری نشست

"سہہ ماہی ادبی محاذ" کے دفتر میں یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک پُر کیف شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔شعری نشست کا آغاز قاری سید مصطفےٰ علی کے تلاوت و دعائیہ کلمات سے آغاز ہوا۔جس کی صدارت شہر کے کہنہ مشق شاعر جناب ساجد اثر نے کی اور نظامت کے فرائض جناب رفیق رضا نے بحسن خوبی انجام دی۔شریک شعرا میں جناب ڈاکٹر کرامت علی کرامت، جناب سعید رحمانی (اڈیٹر ادبی محاذ کٹک) جناب ناظم قمر، جناب ساجد اثر، جناب رفیق رضا، جناب اسحاق انور، جناب صلاح الدین تسکین، جناب عظیم الدین عظیم، جناب برہان ادیب، جناب شہزادہ ظفر، جناب ارشد جمیل اور راقم الحروف یونس عاصم نے نشست کو چار چاند لگائے۔سامعین حضرات میں شیخ قریش، سید فرقان علی، سید مصطفےٰ علی، محمد ظہور نے شرکت کی۔بعدازاں جناب سید فرقان علی نے اظہار تشکر اور آئندہ اس طرح کی نشست ہونے کی پُرزور اپیل کی۔

محفل مشاعرہ

ایک ہی گھر میں ہیں الگ سب کے کمرے☆ گھر کا مالک ہے جو سمٹا ہے وہ انگنائی تک

حلقہ تشنگانِ ادب کی 489ویں شعری نشست کا روہنی دہلی میں شاندار انعقاد

نئی دہلی 23 جنوری، اسٹاف رپوٹر: حلقہ تشنگانِ ادب کی 489ویں شعری نشست کا **انعقاد** گان اسپورٹس کلچرل کلب سیکٹر 8 سی 7 روہنی ایسٹ دہلی میں ماہر لسانیات

تصویر میں ڈاکٹر جی آر کنول، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی اور ناظم سیماب سلطانپوری کے ساتھ شاعر رفیق ایٹوی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ودانشور اور مفکر و مدبر ڈاکٹر جی آر کنول کی صدارت اور حلقہ کے جنرل سکریٹری سیماب سلطانپوری کی نظامت میں کیا گیا۔اس موقع پر صدر حلقہ ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ ادبی دنیا میں دو یا تین ضیائی ہیں جن میں شہباز ندیم ضیائی ایک تھے، ان کے جانے کی عمر یہ نہیں تھی، لیکن کیا کریں موت سے کسے مفر ہے۔دہلی کی ادبی فضا سوگوار ہے یہ اردو زبان وادب اور دہلوی تہذیب کا خسارہ ہے۔چند لمحوں کی خاموشی اختیار کر کے تعزیت کا اظہار کیا گیا، اور شہباز ندیم ضیائی کی مغفرت کیلئے دعا کی گئی۔ بالا جیت پلازہ مارکیٹ کی بیک سائڈ میں منعقد پروگرام کے کنوینر ہندی گیت ودھا میں معروف نوجوان رام لوچن تھے۔قارئین کے لئے پسندیدہ اشعار کا نمونہ درج ذیل ہے۔

زباں کی نرم گفتاری کے آگے۔کنولؔ غیض وغضب کچھ بھی نہیں ہے

(ڈاکٹر جی آر کنول)

جو بات تری شوخ نگاہوں نے کہی ہے۔وہ بات کمالاتِ سخن پھانک گئی ہے

(متیر ہوشیار پوری)

وہ حسیں جن کی طلب میں تھے نگاہوں کے ہجوم۔ اب ہیں انکے گرد یادیں اور آہوں کے ہجوم

(ستیہ پال اشک)

کس میں جرأت ہے جو جھانکے گا کسی کی آستیں۔ وہ تمہاری آستیں ہو یا ہو میری آستیں

(ڈاکٹر ظفر مرادآبادی)

ایک ہی گھر میں ہیں الگ سب کے کمرے۔گھر کا مالک ہے جو سمٹا ہے وہ انگنائی تک

(سیماب سلطانپوری)

نجومی دیکھ میرا ہاتھ بولا۔شکستہ خط میں کچھ لکھا گیا ہے

(ڈاکٹر رانا گنوری)

انہیں اب علم کیا ہو گا قلم تختی سیاہی کا۔ہمارے عہد کی نسلیں تو کمپیوٹر چلاتی ہیں

(حبیب سیفی)

زندگی کا معرکہ سر کرلیا تو چل دیئے۔آہنی دیوار میں در کرلیا تو چل دیئے

(مجاز امروہوی)

صلیب ودار پر تنہا تھا میں وہ صف بہ صف تھے۔خلافِ حق یہاں جتنے تھے سب اسکی طرف تھے

(ڈاکٹر ایم آر قاسمی)

اک آہ بھری ہم نے غم دل سے نکل آیا۔محفل میں ہزاروں تھے اک تو نہ نظر آیا

(رفیق ایٹوی)

میٹھی نہ ہو پھر کیسے مری طرزِ کلامی۔عاشق ہیں ازل ہی سے ترے اردو زباں ہم

(نزاکت امروہوی)

میں تو گرتے پڑتے آہی گیا منزل تلک۔قافلہ جو ساتھ تھا اس قافلے کا کیا ہوا؟

(آشیش سنہا قاصد)

جب بھی ماضی کی یاد آئی ہے۔اس کی قیمت بہت چکائی ہے

(فخر الدین اشرف)

مجھ کو پرواہ کیوں نہیں رہتی۔لب پر کوئی آہ کیوں نہیں رہتی

(ارملا مہہ جبیں)

اوج پر اس کا ہی مقدر ہے۔جس کو صحبت تری میسر ہے

(عاصم کرتپوری)

اس کے علاوہ ایس کے گرگ نے اپنی نظم خاموش عدالت جاری ہے، ستیہ پال چاولہ، راجندر نٹ کھٹ، رام لوچن، آمود کمار، سردار سریندر ساگر، سبھاش بھاشی نے اپنی نظم ترنگا سنائی۔جتیندر کمار نے بھی اپنے کلام سے محظوظ کیا۔میزبان رام لوچن کے اظہار تشکر اور ضیافت کے اعلان کے ساتھ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

جشنِ ظہیر آفاق

تامل ناڈو میں اردو زبان وادب کی پچاس سالہ قابل تحسین خدمات کے پیش نظر اردو اسکالرز اکیڈمی' چینئی کے زیر اہتمام ۷ارجنوری ۲۰۱۷ء کی شام کلچرل سنٹر' سیمینار ہال میں اردو کے ممتاز فکشن نگار' شاعر وتنقید نگار ڈاکٹر ظہیر آفاق کے اعزاز میں جشنِ آفاق منایا گیا۔مولانا رشید سحر نقشبندی نے صدارت فرمائی۔ناگپور کے ڈاکٹر محفوظ الرحمن خان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔اردو اسکالرز اکیڈمی کے سکریٹری محروق صدیقی نے جلسہ کی کاروائی کو رونق بخشی۔تامل ناڈو کی ادبی تنظیم' دانشوران شعروادب کی پیش کش' موصوف کی تخلیقی کائنات پر ضمیمہ ''جلوہ دانش'' کا اسلم پرویز نے اجراء کیا۔ڈاکٹر محمد نعیم عابد نے تقریباً آٹھ یونیورسٹیوں کے اسکالروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو اسکالروں کی اہمیت پر اپنے بلند آہنگ تاثرات پیش کئے۔ان اسکالروں میں پرویز قیصری' گاندھی بابو' محسن زیدی' عباس علی خان' طاہرہ تبسم' منی بیگم' پاروتی شبنم' مہدی حسن' یوسف شہناز کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔جشنِ آفاق کی پیش رفت پر اردو ادب کے جن معتبر مفکرین نے اپنے گراں قدر تاثرات سے نوازا اور ان اسکالروں کو گلہائے عقیدت کے نذرانے پیش کیے۔جلسے کو خطاب کرنے والوں میں پنجاب ایسوسیشن کے جنرل سکریٹری شری رمیش لامبا جی' بہار کے پروفیسر آفاق عالم صدیقی' گلبرگہ کے پروفیسر جعفر حسین جعفری' کوزی کوڈ کی پروفیسر کلثوم فاطمہ' قابل ذکر ہیں۔جلسہ کے آخری دور میں غزل کی شام' طلعت محمود کے نام سے کروکی میوزک نے ساز اور آواز کا جادو جگایا۔نوازش عالم خاں کے ہدیۂ تشکر پر باذوق سامعین سے بھرپور جلسہ اختتام پذیر ہوا۔(مرسلہ: عتیق احمد اشفاق چینئی)

ڈاکٹر سید منیر الدین سحر سعیدی نہیں رہے

اورنگ آباد (دکن) کے ممتاز شاعر اور ادیب ڈاکٹر سید منیر الدین سحر سعیدی طویل علالت کے بعد ۷۷رسال کی عمر میں ۲۶رجنوری ۲۰۱۷ء کو اورنگ آباد میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر سحر سعیدی ۱۸رمئی ۱۹۴۰ء کو اورنگ آباد کے سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔میٹرک تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں آپ نے کلرک کے طور پر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں ملازمت کا آغاز کیا اور ۱۹۹۹ء میں سینئر اسسٹنٹ کی حیثیت سے وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئے۔دوران ملازمت انھوں نے میسور یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔۱۹۸۷ء میں مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں آزادانہ طور پر ''شیخ چاند۔حیات اور ادبی خدمات'' پر مقالہ پیش کرکے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔یہی مقالہ ۱۹۹۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

سحر سعیدی ایک خوش فکر شاعر تھے۔ان کی غزلوں کے چار مجموعے شائع ہوچکے ہیں جن میں ''مضراب'' (۱۹۷۸ء)، ''کمند ہوا'' (۱۹۸۰ء)، ''شعر خوشبو لے'' (۱۹۸۷ء) اور ''شعر میر اشوق انگیز'' (۲۰۱۵ء) اردو حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں۔

۲۰۰۷ء میں سحر سعیدی نے معروف محقق شیخ چاند کے شائع شدہ تمام مضامین کو نہایت تگ ودو کے بعد حاصل کیا اور انھیں ''مضامین شیخ چاند'' کے نام سے شائع کیا۔مقتدر اخبارات اور رسائل میں شائع شدہ اہم ادبی مضامین اور شذرات کی فوٹو کاپیز کو انھوں نے ''ادبی تراشے'' کے عنوان سے ۱۵رضخیم جلدوں میں مرتب کیا جو ریسرچ اسکالرز کے لیے ایک قیمتی خزانہ ثابت ہورہا ہے۔حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد ۲۰۱۵ء میں مرحوم نے اپنی خودنوشت سوانح ''گلابوں کی مہک'' شائع کی۔۲۰۱۶ء میں دکن کی مشاہیر ادبی شخصیات پر تحریر کردہ ان کے مضامین کا مجموعہ ''خاصانِ خوش خیال'' شائع ہوا۔موقر کتابی سلسلہ ''عالمگیر ادب'' اورنگ آباد نے مرحوم کی ادبی زندگی پر محیط ''سحر سعیدی فن اور شخصیت'' کے عنوان سے کتاب شائع کی ہے۔

پسماندگان میں تین بیٹیاں، بھائی اور بہنیں اور ان کی اولادیں ہیں۔